مسلم امّت

منزل اور راستہ

سید سعادت اللہ حسینی

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لله الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدَى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ أَشْهَدُ أَنْ لَا اله إِلاَّ الله وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ الله۔ اللهم صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آله وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِيْنَ۔

زندگی نو کے ادارتی کالم ”اشارات“ میں شائع مضامین کے اس مجموعے کو قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے بے حد مسرت ہورہی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی پیش کرنے کی سعادت حاصل ہورہی ہے۔ الحمدللہ رب العالمین۔ دعا ہے کہ اس کتاب کے مباحث غور وفکر کی نئی راہوں کو کشادہ کرنے اور ہمارے پیچیدہ مسائل کے قابل عمل حل تلاش کرنے میں معاون ثابت ہوں۔ آمین۔

میں شکر گزار ہوں زندگی نو کے قارئین کا جن کا مسلسل مطالبہ اور اصرار اس مجموعے کی اشاعت کا سبب بنا اور ماہ بہ ماہ جن کے قیمتی مشوروں اور تبصروں سے مصنف نے حوصلہ بھی حاصل کیا اور روشنی بھی۔ ہمارے مشفق بزرگ محترم ڈاکٹر حسن رضا صاحب کا میں بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے اکثر مضامین کا اشاعت سے قبل بالاستیعاب مطالعہ فرمایا اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ ڈاکٹر محمد رفعت، ایس امین الحسن، ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی صاحبان اور بعض دیگر دوستوں اور بزرگوں کے مشوروں سے بھی کئی مضامین میں استفادہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان سب احباب

کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔

برادرِ محترم ڈاکٹر محی الدین غازی صاحب کا تو کئی وجوہ سے شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ ان کے مشوروں سے تو تقریباً ہر مضمون میں استفادہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ، ان کے مسلسل اصرار، صبر آزما فالو اپ اور ہر قدم پر تعاون کے بغیر ان مضامین کی موجودہ شکل میں اشاعت ممکن نہیں تھی۔ برادر موصوف کا اس بات کے لیے بھی شکریہ کہ انھوں نے اس کتاب پر فکر انگیز مقدمہ تحریر فرمایا جس نے کتاب کی وقعت اور افادیت بڑھادی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم و صلاحیت میں برکت عطا فرمائے اور ان سے دین و تحریک کی عظیم خدمت لے۔ آمین۔

برادرِ عزیز جناب عرفان وحید نے جس محنت اور لگن سے اس کتاب کی ترتیب، نوک پلک سنوارنے اور دیدہ زیب پیش کش کو یقینی بنانے میں کلیدی رول ادا کیا ہے، اس کے لیے وہ ہمارے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔

برادرِ عزیز جناب پرویز مانڈوی والا نے اس کتاب کو خوب صورت انگریزی میں منتقل کیا۔ اس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں، اور اُن دوستوں کے لیے بھی سراپا سپاس ہوں جو ان مضامین کو پابندی سے ہر ماہ آڈیو بک کی صورت میں جاری کرتے رہے، نیز ان کرم فرماؤں کا بھی شکریہ جو بڑے اہتمام کے ساتھ ان مضامین کا تمل، ملیالم، تلگو اور گجراتی زبانوں میں ترجمہ کرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ ان سب محسنین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

سید سعادت اللہ حسینی

۱۱ر نومبر ۲۰۲۰، نئی دہلی

مسلم امت کے لیے لائحہ عمل
ضروری تقاضے

ڈاکٹر محی الدین غازی

جیل کے دو قیدیوں نے خواب دیکھے، وہ خواب ان کی ذاتی زندگی سے متعلق تھے، اس کے کئی برس بعد ملک کے بادشاہ نے خواب دیکھا، وہ خواب پوری مملکت کے مستقبل سے متعلق تھا۔ درباریوں نے اس کے خواب کو سنجیدگی سے نہیں لیا، لیکن بادشاہ کی فکر بڑھتی گئی، آخر کار برسوں سے جیل میں پڑے یوسف نے خواب کی تعبیر بھی بتائی اور مستقبل کے ہول ناک خطرے سے بچنے کا لائحہ عمل بھی سجھادیا۔ صحیح وقت پر درست اسٹریٹجی نے پوری قوم کو ہلاکت سے بچالیا۔

خوابیدہ اقوام کو خواب غفلت سے جگانے، پس ماندہ اقوام کو ترقی کی راہیں دکھانے اور ستم رسیدہ اقوام کو ظلم کے خلاف سینہ سپر کرنے کے لیے جہاں وعظ ونصیحت کی افادیت ہوتی ہے، وہیں گہرے غور وفکر کے بعد تیار کیا ہوا لائحہ عمل بھی ازحد ضروری ہوتا ہے۔ سوچی سمجھی اسٹریٹجی کے بغیر واعظانہ کوششیں کچھ اتھل پتھل ضرور پیدا کرتی ہیں، لیکن کسی بڑی تبدیلی تک نہیں پہنچاتی ہیں۔

بیدار مغز، انقلاب دوست اور ترقی یافتہ اقوام اسٹریٹیجی کی قوت کو اچھی طرح سمجھتی اور استعمال کرتی ہیں۔ ان کی صورت حال ان کے منصوبے کے مطابق ہوتی ہے، بصورت دیگر ان کا منصوبہ ان کی صورت حال کے مطابق ہوتا ہے۔

یوں تو کسی بھی سطح پر اور کسی بھی گروہ کے لیے لائحہ عمل کی تیاری کچھ ضروری تقاضے رکھتی ہے۔ تاہم اسلامی امت کی خصوصی حیثیت لائحہ عمل کے عمومی تقاضوں کے ساتھ کچھ جداگانہ تقاضے بھی رکھتی ہے۔ ہم اختصار کے ساتھ ان میں سے کچھ اہم تقاضوں کا ذکر کریں گے، جن کی بھرپور رعایت مسلم امت کے لیے لائحہ عمل تجویز کرتے ہوئے ضروری معلوم ہوتی ہے۔

نصب العین کی اہمیت کا ادراک

اقوام عالم کے درمیان مسلم امت کا خاص مقصد اور نصب العین ہے، امت کی بہبود کے کسی بھی لائحہ عمل کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے نصب العین کے ماتحت ہو، اور اس کی تحصیل میں معاون وکارساز ہو۔ نصب العین کے گہرے شعور اور اس سے جذباتی لگاؤ کے بغیر امت کے لیے موزوں لائحہ عمل تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ نصب العین سے تجاہل برتنے کی صورت میں اس کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے کہ دوسرے محرکات اور عوامل نصب العین کی کارفرمائی میں رکاوٹ بن جائیں اور لائحہ عمل پر نصب العین کا رنگ نظر نہیں آئے۔ نصب العین سے بے پروا لائحہ عمل سے امت کے کچھ وقتی مسائل تو حل ہوسکتے ہیں لیکن منزل کی طرف پیش قدمی نہیں ہوسکتی ہے۔ نصب العین سے تفصیلی آگاہی کے لیے وحی الٰہی سے اکتساب ضروری ہے۔ نصب العین کی تفصیلات کا تنہا اور مکمل سرچشمہ وحی الٰہی ہے۔

وحی الٰہی سے اکتساب

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی آیتیں نظریہ سازی کے لیے مرجع ہوتی ہیں، جب کہ طریقہ کار اور اسٹریٹیجی کے لیے خالص انسانی تجربہ وفہم کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے۔ لیکن

یہ بات درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عملی رہ نمائی کے سلسلے میں بھی قرآن مجید کی آیتیں بہت مال دار ہیں، بہتر اسٹریٹجی بنانے کے لیے قرآنی آیات میں وافر مواد موجود ہے۔ لائحہ عمل اور حکمت عملی جیسی راہوں پر غور کرتے ہوئے اگر مرجع وماخذ قرآن مجید کو بنایا جائے تو رہ نمائی کے لیے بہت وافر سامان مل جاتا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ ایسے مواد تک رسائی کی کوششیں بہت کم ہوئی ہیں۔ عام طور سے قرآنی آیتوں کی طرف دلائل حاصل کرنے کے لیے رجوع کیا جاتا ہے۔ اردو میں دلیل کا لفظ زیادہ تر ثبوت کے معنی میں آتا ہے، جب کہ عربی میں یہ لفظ زیادہ تر رہ نما کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہے کہ انسان کی کسی بات تک رسائی ہو اور وہ اس کی شرعی حیثیت طے کرنے کے لیے قرآن مجید کی طرف رجوع کرے، اور اس کے حق میں یا اس کے خلاف ثبوت حاصل کرے۔ تاہم قرآن مجید سے استفادے کا اصل تقاضا یہ ہے کہ رہ نمائی حاصل کرنے کے لیے قرآن مجید کی طرف رجوع کیا جائے۔

قرآن مجید کی آیتوں میں لائحہ عمل کے ایسے ضروری عناصر ملتے ہیں کہ اگر انھیں وہاں سے اخذ نہ کیا جائے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ نگاہ سے اوجھل رہیں۔ اس لیے قرآن مجید سے عملی رہ نمائی کا اکتساب اختیاری نہیں بلکہ ضروری حد تک مطلوب ہے۔

انسانی کسب سے استفادہ

طریقہ کار اور لائحہ عمل کی تفصیلات کے سلسلے میں وحی الٰہی رہ نمائی کا سامان رکھتی ہے، ساتھ ہی وہ انسانی کسب سے استفادے کی نہ صرف اجازت دیتی ہے بلکہ اس پر ابھارتی بھی ہے۔

لائحہ عمل بناتے ہوئے انسانی کسب سے فائدہ اٹھانا مسلم امت کے لیے بھی اتنا ہی ضروری ہے جس قدر ضروری دیگر اقوام کے لیے ہے۔

وحی الٰہی کو اپنی رہ نمائی کا مرجع وماخذ بنانے والے اس لحاظ سے زیادہ خوش قسمت ہوتے ہیں کہ ان کے لیے دو ذخیروں تک رسائی میسر ہوتی ہے۔ انھیں انسانی کسب کے علاوہ وحی الٰہی میں موجود

رہ نمائی کے ذخیرے سے اکتساب کرنے کا موقع بھی حاصل رہتا ہے۔

بہر حال، توقع کی جاتی ہے کہ لائحہ عمل کے ماہرین کے پاس انسانی کسب کا وافر ذخیرہ ہو۔ غور وفکر اور تجربات کے ذریعے دریافت، انکشاف، تخلیق، تنوع سازی، ندرت کاری سے عبارت انسانی ذخیرہ، افراد اور قوموں کے لیے لائحہ عمل کی تیاری میں بہت مفید اور معاون ہوتا ہے۔

حالات کا گہرا شعور

حالات کا سطحی، جزوی اور یک رخا جائزہ لائحہ عمل میں مددگار ہونے کے بجائے اسے کم زور کرنے اور اس کا رخ بگاڑنے کا سبب بنتا ہے۔ ایسا بہت ہوتا ہے کہ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے اور پروپیگنڈہ کسی اور رخ کو دکھاتا ہے۔ کبھی رائی کو پہاڑ بناکر دکھایا جاتا ہے، اور کبھی طوفان کی پردہ پوشی کرکے دریا میں سکون ہونے کا چرچا کیا جاتا ہے۔ غرض صحیح صورت حال جاننے کے لیے قیاس آرائیوں یا سنی سنائی باتوں پر تکیہ کرنے کے بجائے حالات کی نبض پر ہاتھ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ حالات کو جاننے کے تمام مستند ذرائع سے گہرا ربط ہو، اور صحیح خبروں کو غلط خبروں سے الگ کرنے کی صلاحیت ہو۔

انفعالیت سے خود کو بچانا

عام آدمی حالات سے متاثر ہوتا ہے، مایوس کن حالات اسے مایوس کردیتے ہیں، خوش آئند حالات اسے مطمئن کردیتے ہیں، خوف ناک حالات اسے دہشت زدہ کردیتے ہیں، ایسی انفعالیت کے سائے میں جو اسٹریٹجی بنائی جاتی ہے اس کے غلط ہونے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر آدمی حالات کو محسوس ہی نہ کرے تو وہ تجریدی دنیا میں رہتا ہے، اور ایسے لائحہ عمل کی بات کرتا ہے جس کی حالات سے کوئی مناسبت (relevance) نہیں ہوتی ہے۔ درست لائحہ عمل کے لیے ضروری ہے کہ حالات سے آگاہی ہو، حالات میں پوشیدہ سرد و گرم کا احساس ہو اور حالات کے تئیں فکرمندی ہو، البتہ حالات سے انفعالیت نہ ہو۔

جذباتیت نہیں فکرمندی

جذباتیت آنکھوں پر پردہ بن جاتی ہے، جب کہ فکرمندی آنکھوں کی روشنی بڑھادیتی ہے۔ جذباتیت کی اسیر ہوکر پوری قوم اپنی ترجیحات بھول جاتی ہے، اپنی حقیقی ضرورتوں سے غافل ہوجاتی ہے، اور زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ چھوٹی سی بات کو بڑا سمجھ لیتی ہے، اور چھوٹے نقصان کے اندھادھند تعاقب میں بڑا نقصان کر بیٹھتی ہے۔

لائحہ عمل بناتے وقت جذباتیت کو پرے رکھنا اور فکرمندی کو اپنے اوپر سوار کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جس طرح غصے میں فیصلہ نہیں کرنا چاہیے، اسی طرح جذباتیت میں منصوبہ نہیں بنانا چاہیے۔ البتہ سچی فکرمندی بہت ضروری ہے۔ فکرمندی ہی وہ چیز ہے جو دماغ کا تیل جلانے پر مجبور کرتی ہے۔ اور جو تمام تر ذہنی توانائی جھونک دینے پر اکساتی ہے۔

ردِعمل کی نفسیات سے محفوظ ردعمل

ردِعمل کا شکار ہوکر لائحہ عمل بنانا پوری قوم کو خطرے میں ڈھکیلنا ہے، اس کی بجائے ردعمل طے کرنے کے لیے لائحہ عمل بنانا چاہیے۔ ردعمل کی نفسیات سوچ کا دائرہ بہت تنگ کردیتی ہے، اور ممکنہ راستوں کی تعداد بہت گھٹادیتی ہے۔ ردعمل ایک فطری امر ہے، لیکن ردعمل کی نفسیات آدمی کو غیر فطری حالت میں پہنچادیتی ہے۔ ایسی نفسیات سے باہر آکر بہتر سے بہتر ردعمل کے بارے میں سوچنا اچھے لائحہ عمل کے لیے ضروری ہے۔

حالات کے مابعد پر نگاہ

مستقبل کے تعلق سے بہت زیادہ اندیشوں یا حد سے بڑھی ہوئی خوش گمانیوں میں گرفتار ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ لوگ حالات کے آئینے میں مستقبل کو دیکھتے ہیں۔ لائحہ عمل بنانے کے لیے مستقبل پر نگاہ ضروری ہے۔ البتہ مستقبل بینی وہ نہیں ہے جو حال ہی کے امتداد کو مستقبل کی حیثیت سے دیکھے، مستقبل بینی وہ ہے جو حالات کے بعد والے مستقبل کو دیکھے، اور جو عارضی حالات اور مستقل حالات کے درمیان فرق کرسکتی ہو۔

سب کے لیے یکساں افادیت

ضروری ہے کہ لائحہ عمل کے اندر وہ وسعت پائی جائے جس میں پوری امت سما سکے، اگر پوری امت کے لیے لائحہ عمل بنایا جائے تو پھر امت کی داخلی تقسیم اس پر اثر انداز نہ ہو۔ امت کی ہر جماعت اور ہر گروہ کے لیے وہ یکساں طور پر اہم اور مفید ہو۔ اگر صرف اپنے گروہ کو پیش نظر رکھ کر لائحہ عمل بنایا جائے گا تو وہ پوری امت کا لائحہ عمل نہیں ہو سکے گا، خواہ اسے کوئی نام دیا جائے۔

شفافیت اور اخلاص

امت کے لیے پیش کیا گیا لائحہ عمل پورے اخلاص کے ساتھ امت کے فائدے کے لیے ہی تیار کیا جائے، اس میں کسی مخصوص ایجنڈے کی کارفرمائی نظر نہیں آئے۔ لائحہ عمل سے متوقع عمومی فائدے اور نتائج بہت واضح ہوں۔ لوگوں کی بدگمانیوں کا نشانہ بننے سے بچنا بھی ضروری ہے، اور محض بدگمانی کے الزام کے ڈر سے لائحہ عمل میں لیپا پوتی کرنا بھی درست نہیں ہے۔

دیگر اقوام کے ساتھ صلہ رحمی

ایک خاندان کے افراد کی طرح ملک اور اس کی تمام اقوام مسلم امت کی تقدیر کا حصہ ہیں، ان کے درمیان صلہ رحمی کا ہونا مطلوب ہے۔ ان سے الگ تھلگ رہ کر اپنی تعمیر ایک خیال خام ہے۔ مسلم امت کے لیے لائحہ عمل ادھورا اور تشنہ رہے گا اگر اس سے امت کو ملک کی فلاح و بہبود کے لیے اپنا زبردست کردار ادا کرنے کی واضح عملی رہ نمائی اور طاقت ور ترغیب نہیں ملے۔

بے لاگ جائزہ اور تنقید

غلطیوں سے بچنے کے لیے غلطیوں کی نشان دہی ضروری ہے۔ درست لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے غلط اسٹریٹجی پر تنقید لازم ہے۔ جذبات کی ایسی رعایت جو انجام کی قیمت پر کی جائے کبھی درست نہیں ہو سکتی ہے۔ جائزے اور تنقید کا نشانہ قیادت بھی بن سکتی ہے، عوام کے نازک جذبات کو بھی ٹھیس پہنچ سکتی ہے، اس سے پہلے جو طریقہ کار اور پالیسیاں اختیار کی گئیں وہ بھی زیر بحث آسکتی ہیں، لیکن ایسے تلخ اور جرأت طلب گھونٹ حلق سے اتارنا ضروری ہیں۔

ٹھیراؤ کے بجائے پیش قدمی

آخری بات یہ ہے کہ لائحہ عمل وہ ہے جو اقدامیت اور فعالیت کے راستے دکھانے والا ہو، اس میں کسی بھی طرح کی پسپائی اور فرار کی حوصلہ افزائی ہو، نہ ہی جمود و تعطل کی کسی صورت کا اقرار ہو۔ جب لوگوں کو اپنے سامنے راہیں مسدود نظر آئیں تو ضرورت ایسے لائحہ عمل کی ہوتی ہے جو بند دروازے کو کھولنے اور راہ میں حائل دیوار میں رخنہ ڈالنے کے طریقے سجھائے۔

☆☆☆

محترم سید سعادت اللہ حسینی نے زیر نظر کتاب "مسلم امت، منزل اور راستہ" میں ہندوستان کی مسلم امت کے سامنے درپیش حالات سے نبرد آزما ہونے اور اپنی ذمہ داریوں کو انجام دینے کے تعلق سے اصولی اور عملی نکات پر مشتمل لائحہ عمل پیش کیا ہے، اس لائحہ عمل میں مذکورہ بالا تقاضوں کو کہاں تک برتا گیا ہے اس کا فیصلہ تو اہل فکر و دانش کریں گے، لیکن یہی کیا کم ہے کہ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ان تمام تقاضوں کی طرف ذہن متوجہ ہوتا ہے، اور ان کی موجودگی کا فرحت بخش احساس ہوتا ہے۔

اس کتاب کے تمام مشمولات ایسے حالات میں لکھے گئے جو باہم مختلف مگر سنگینی میں ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ایسے غیر معمولی حالات اور بے پناہ شور و غل میں جب عوام و خواص کا ذہنی تناؤ حد سے زیادہ بڑھ جائے، دماغ سوچنا بند کر دے، اعصاب بوجھل ہو جائیں، تو سب سے زیادہ ضرورت ایک لائحہ عمل کی ہوتی ہے جس کا محرک فکرمندی ہو، اور جس کی پشت پر ژرف نگاہی اور ذہنی توانائی ہو۔ کتاب کے مضامین خبر دیتے ہیں کہ مصنف کے پیش نظر اسی ضرورت کی تکمیل رہی ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ اس کتاب کی کوکھ سے امت کو راستہ اور منزل دکھانے والی بہت سی ذہنی اور عملی کوششیں جنم لیں۔

مزاج اور رویے

ماہ رمضان
ہمارے رویے اور کووڈ کی عالمی وبا

اس دفعہ رمضان المبارک کی بابرکت ساعتوں کا ظہور ایک بالکل مختلف ماحول میں ہوا ہے۔ اہلِ ایمان کے دل مغموم ہیں کہ رمضان کی آمد ہوچکی لیکن مسجدیں بند ہیں۔ باجماعت تراویح کے روح پرور مناظر، عبادت کے ذوق وشوق سے سرشار بندگان خدا سے آباد مسجدیں، صبح وشام وہاں سے بلند ہوتی نماز و تلاوت کی آوازیں، سحر وافطار کی ہماہمی، بڑھ چڑھ کر روزے داروں کو افطار کرانے کی دوڑ، یہ سب رمضان المبارک کے نہایت دل ربا مناظر اور اسلام کی پاکیزہ تہذیب کے دل کش مظاہر ہیں۔ ان سب سے ہماری آنکھیں برسوں سے آشنا رہی ہیں۔ اس سال ان مناظر کے لطف و سرور سے ہم محروم رہیں گے، بلکہ شاید شب قدر کی تلاش اور اعتکاف کی رونقیں بھی ویسی نہیں رہیں گی جیسے ہمیشہ ہوا کرتی ہیں۔ اس پر غم وافسوس اور محرومی کا احساس ہونا بالکل فطری ہے۔

اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ اہل ایمان کو آزماتا ہے۔ وہ بظاہر مشکلات بھی پیدا کرتا ہے تو اس میں کچھ نہ کچھ خیر کا سامان ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيرًا يُصِبْ مِنْهُ (اللہ تعالیٰ جب کسی کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے تو اس کو مشکلات سے گزارتا ہے۔) ایک بندۂ مومن کا اپروچ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کی مرضی پر راضی اور خوش رہے اور مشکلات میں بھی خیر کا پہلو تلاش کرے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کے حالات میں اپنی بندگی کا حکم دیا ہے۔ جن حالات میں جس طرح کی بندگی کا تقاضا ہو، اس طرح بندگی کا حق ادا کرنا یہی بندہ مومن کی ذمہ داری ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ مشکل حالات میں جس طرح ممکن ہو نماز ادا کریں اور جب حالات معمول پر آجائیں، تو اس طریقہ کی پابندی کریں جو شریعت نے متعین کیا ہے۔ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔ (ڈر کی حالت ہو، تو خواہ پیدل ہو، خواہ سوار، جس طرح ممکن ہو، نماز پڑھو اور جب امن میسر آجائے، تو اللہ کو اُس طریقے سے یاد کرو، جو اُس نے تمہیں سکھا دیا ہے، جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۳۹) یہ لچک اسلام کا حسن ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ دین اسلام، رحمن ورحیم خدا کا دین ہے۔ یہ دین انسانی جان کے تحفظ کو اولیت دیتا ہے اور جان کے تحفظ کے لیے احکام میں تبدیلی اور تخفیف بھی کرتا ہے۔ اس وقت جو حالات ہم کو درپیش ہیں ان میں اللہ کے دین کی تعلیم یہی ہے کہ ہم رمضان مختلف طریقہ سے گزاریں۔ نمازیں گھروں میں ادا کریں۔ ہم اس ذریعہ سے بھی اللہ کے حکم ہی کی تعمیل کر رہے ہیں اور اس میں بھی ہماری بہتری اور تزکیہ کا سامان ہے۔

آزمائش، تنبیہ یا سزا؟

اس وقت جگہ جگہ یہ بحث چل رہی ہے کہ یہ وبا کی آفت عذاب ہے، تنبیہ ہے یا آزمائش وامتحان ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ایک بڑی اہم بات مفتی محمد شفیعؒ نے نقل کی ہے، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مصیبت بیک وقت گناہگاروں کے لیے عذاب اور اچھے انسانوں کے لیے آزمائش ہوسکتی ہے۔ کوئی مصیبت ہمارے لیے آزمائش ہے یا سزا ہے اس کی کسوٹی شاہ صاحب نے یہ بتائی ہے کہ جن نیک لوگوں پر آزمائش اور امتحان کی خاطر مصیبتیں آتی ہیں اللہ تعالیٰ ان کے قلوب کو مطمئن کر دیتا ہے اور وہ ان مصائب و آفات پر ویسے ہی راضی ہوتے ہیں جیسے بیمار کڑوی دوا یا آپریشن پر باوجود تکلیف محسوس کرنے کے راضی ہوتا ہے۔ جن گناہ گاروں پر عذاب نازل ہوتا ہے وہ بے چین ہو اٹھتے ہیں۔ ان کی پریشانی کی حد نہیں رہتی، بعض اوقات ناشکری بلکہ کلمات کفر تک پہنچ جاتے ہیں۔[1] مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک پہچان یہ بتائی کہ جس مصیبت کے ساتھ انسان کی

اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ، اپنے گناہوں کا ادراک اور توبہ و استغفار کی رغبت زیادہ ہو جائے وہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ سزا یا قہر نہیں بلکہ مہر اور عنایت ہے اور اس کے مقابلے میں جب مصیبت، اللہ کی ناشکری کا سبب بنے، گناہوں میں اور زیادہ انہماک بڑھ جائے تو وہ قہر الٰہی اور عذاب کی علامت ہے۔ اس لیے ان حالات کو دیکھنے کا مومنانہ انداز یہ ہے کہ ہم اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ممکنہ کوشش کریں۔ تمام تدابیر اور اسباب کو بروئے کار لائیں۔ ضروری احتیاطی تدابیر اختیار کریں اور اس دوران اللہ کی مرضی پر مطمئن رہیں اور اس میں خیر کا پہلو تلاش کریں۔

ہماری تاریخ کا یہ منفرد ماہ رمضان اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے زمانے میں مقدر فرمایا ہے جو ہماری تاریخ کا نہایت پر آشوب زمانہ ہے۔ امت مسلمہ اپنی تاریخ کے نہایت نازک دور سے گزر رہی ہے۔ چیلنجوں اور مشکلات کی بظاہر چوطرفہ یلغار ہے۔ ایسے میں ماہ تربیت و تزکیہ کی ان حالات کے ساتھ آمد یقیناً اللہ تعالیٰ کی کسی بڑی مصلحت کا حصہ ہے۔ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس رمضان کو امت کی تربیت کے لیے کسی خاص پہلو سے استعمال فرمانا چاہتا ہے۔ آیئے اپنے شعور و فہم کا ممکنہ استعمال کرتے ہوئے اس پر غور کریں اور دیکھیں کہ ان حالات میں ہم ماہ رمضان کو اپنے اندر کس طرح کی تبدیلیوں کا ذریعہ بنا سکتے ہیں؟

رمضان، قرآن اور تقویٰ

رمضان المبارک ماہ قرآن ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ۔ (رمضان وہ مہینہ ہے، جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے، جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۸۵) اس ماہ میں روزے فرض کیے گئے ہیں جن کا مقصد تقویٰ کی افزائش ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔ (اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کر دیے گئے، جس طرح تم سے پہلے انبیا کے پیروؤں پر فرض کیے گئے تھے اس سے توقع ہے کہ تم

میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو گی۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۸۳)

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ وہ زندگی کی ایک خاص اسکیم دیتا ہے۔ ایک نظام عقائد (belief system)، ایک نظام اقدار (value system)، اس پر مبنی ایک طرز حیات (lifestyle)، ایک تہذیب اور ایک سویلائزیشن، انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے یہ سارے پہلو اس اسکیم میں شامل ہیں۔ قرآن کی تجویز کردہ انسانی زندگی کی یہ اسکیم، انسانوں کی بھلائی ہی کے لیے ہے۔ اسی میں انسانوں کی دنیا اور آخرت کی کام یابی کا راز پوشیدہ ہے۔ قرآن کی اس اسکیم کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے اندر ضبط نفس (self control) ہو، قرآنی قدروں پر عمل کے لیے قوت ارادی (will power) ہو، اللہ کا ڈر ہو، محتاط اور منضبط زندگی کی عادت ہو، اسے قرآن تقویٰ کہتا ہے۔ رمضان اس تقویٰ کی افزائش کا ذریعہ ہے۔ قرآن، تقویٰ اور رمضان کے اس مثلث کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ رمضان ایک ماہی ٹریننگ کورس ہے جس سے اللہ تعالیٰ ہر سال مسلمانوں کو گزرنے کا موقع دیتا ہے تاکہ وہ تقویٰ حاصل کریں اور سال بھر قرآنی زندگی اختیار کریں۔

تقویٰ کو قرآن بہت اہمیت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پسند یہ ہے کہ اہل ایمان کی زندگی کی بنیاد تقویٰ پر ہو۔ أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ۔ (بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے تقوی اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو۔ سورہ توبہ، آیت ۱۰۹) آخرت میں کام یابی بھی تقویٰ والوں ہی کی ہے وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ۔ (اور آخری انجام پرہیز گاروں ہی کے حق میں ہوتا ہے۔ سورہ اعراف، آیت ۱۲۸) وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ۔ (اور انجام کی بھلائی تقوی ہی کے لیے ہے۔ سورہ طٰہٰ، آیت ۱۳۲) اور دنیا کی کام یابی، اللہ کی عنایات کا حصول اور مشکلات سے نجات، یہ سب بھی تقویٰ ہی پر منحصر ہے۔ وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔ (اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے لیے مشکل سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔ اور اسے ایسی جگہ سے رزق عطا کرے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہو گا۔ سورہ طلاق، آیت ۲،۳)

اللہ تعالیٰ کا مقصود ہے کہ ماہ قرآن آئے تو مسلمان ہر طرف سے یکسو ہو جائیں۔ قرآن پڑھیں، اس پر خوب غور کریں۔ اپنے گھر میں بھی پڑھیں اور رات کی تنہائیوں میں خدا کے دربار میں پوری طرح یکسو ہو کر کھڑے ہو جائیں اور اس قیام کی حالت میں خوب قرآن پڑھیں اور سنیں اور اس طرح، اس ماہ پورے قرآن سے گزریں۔ انھیں اچھی طرح معلوم ہو جائے اور اس کی یاددہانی ہو جائے کہ قرآن کیسی زندگی چاہتا ہے؟ اور قرآن کا فلسفہ حیات ان کے ذہن نشین ہو جائے۔

وہ قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں اپنا احتساب کریں۔ دیکھیں کہ ان کی زندگیوں میں کہاں کہاں انحراف (deviation) پایا جاتا ہے، اس پر توبہ واستغفار کریں۔ یہی وجہ ہے کہ رمضان سے فیض یاب ہونے کے لیے ایک شرط یہ بتائی گئی ہے کہ مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَلَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ (جس نے ایمان واحتساب کے ساتھ رمضان میں قیام اللیل کیا، اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔[۲])

پھر اپنی کم زوریوں کو دور کرنے کے لیے اور قرآن کی بتائی ہوئی خوبیوں اور حسنات کو اپنی زندگیوں میں داخل کرنے کے لیے روزے کے ذریعے قوت ارادی حاصل کریں۔ مومن کی پوری زندگی ایک طرح سے روزے ہی کی زندگی ہے۔ اس پر لازم ہے کہ زندگی بھر اللہ کی رضا کے لیے اپنی نفسانی خواہشات پر قابو رکھے۔ اپنی عادتوں کو بدلے۔ ایسی بہت سی چیزوں سے، جو اللہ کو پسند نہیں ہیں، باز رہے۔ اس طرح ایک نسبتاً ہلکا پھلکا روزہ تو ہر مسلمان کو زندگی بھر رکھنا ہوتا ہے۔ اس کی ٹریننگ کے لیے مہینہ بھر ایک مشکل تر روزے سے ہم گزرتے ہیں تاکہ باقی زندگی کا آسان روزہ ہم رکھ سکیں۔

قرآن کی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ حقوق العباد سے متعلق ہے۔ روزے کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس سے اللہ کے غریب، مجبور، محروم اور بھوکے انسانوں کے دکھ درد کا احساس ہوتا ہے۔ ہم ان کی تکلیف کو محسوس کرتے ہیں۔ صدقہ وخیرات، زکوٰۃ وفطرہ اور مختلف بہانوں سے غریبوں کے کام آکر اس لطف وسرور کا احساس کرتے ہیں جو ناداروں کے کام آنے سے عطا ہوتا ہے۔ اور باقی زندگی

کے لیے قرآن کے غریب پرور مزاج کی اپنے اندر افزائش کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو یہ بھی مطلوب ہے کہ اس مہینہ ہم یکسو ہوکر اللہ سے تعلق قائم کریں۔ ذکر ودعا، تلاوت اور توبہ واستغفار کے ذریعے روحانی قوت سے مالامال ہوں تاکہ باقی زندگی دین پر عمل آوری آسان ہوجائے۔

جب آخری عشرہ آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہوتا ہے کہ ان سب اعمال اور مشقوں میں ہم شدت پیدا کردیں۔ اعتکاف اور شب قدر کی تلاش کے بہانے سے اللہ تعالیٰ سے قریب ترین ہوجائیں۔ روحانی پاکیزگی اور اخلاقی بلندی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام کو حاصل کریں۔ یہاں تک کہ جب شب انعام یعنی عید کی رات آپہنچے تو ہمارا سب کچھ بدل چکا ہو۔ ہم دھل دھلاکر ایک بالکل نئی شخصیت بن جائیں۔ ہمارا وجود قرآن سے ہم آہنگ ہوجائے۔ اور ایک پاکیزہ تر، زیادہ متقی، زیادہ باعمل، قرآنی تعلیمات سے زیادہ ہم آہنگ وجود کے ساتھ ہم باقی زندگی کا سفر جاری رکھیں۔

یہ اسکیم ہے جو رمضان، تقویٰ اور قرآن کے اس پاکیزہ مثلث پر غور کرنے سے سمجھ میں آتی ہے۔ اس اسکیم میں، اسلامی عبادتوں کی ساری اسکیموں کی طرح، عبادات کے ظاہری مراسم کے ساتھ اس کی روح اور اس کے مقاصد پر زور ہے۔ ہمارا جتنا زور عبادات کے ظاہری مظاہر پر ہے اگر اتنا ہی اس کے مقاصد اور اس کی اسپرٹ پر ہوتا تو امت مسلمہ دنیا کے لیے بہترین آئیڈیل ہوتی۔ وہ اُس بلند اخلاقی مرتبے پر فائز ہوتی کہ دنیا کی امامت کے لیے کوئی اور اس کے مقابلہ میں ٹک ہی نہیں پاتا۔ وہ بنی نوع انسان کے لیے رحمت اور ساری انسانی آبادی کے لیے بے پناہ نافعیت کی حامل ہوجاتی۔

ماہ رمضان اور ہمارے رویے

لیکن اس موقع پر یہ بات خاص طور پر غور طلب ہے کہ ادھر کئی برسوں سے ہمارے رمضان کی کیا حالت ہے؟ عام دیکھنے والوں کے لیے رمضان ایک سالانہ میلہ (annual festival) بن گیا ہے۔ دھیرے دھیرے یہ صورت حال بن گئی ہے کہ رمضان کی مبارک ساعتوں میں روحانی پاکیزگی اور قلب کی حضوری پر ہماہمی اور رنگارنگی کا غلبہ ہوگیا۔ پر رونق بازاروں کی چکاچوند اور ذائقہ

دار کھانوں کے لطف و سرور نے ان خاص کیفیتوں کو مدھم کر دیا جو رمضان کا خاصہ ہیں۔ تراویح کی بڑی بڑی جماعتیں ہوتی ہیں لیکن اُس حضوری قلب اور خشوع و خضوع کے بغیر جو اس نماز سے اصلاً مطلوب ہے۔ قرآن سنا جاتا ہے لیکن اس کے مطالب پر غور کرنے اور اس کی روشنی میں اپنا جائزہ لینے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ ہر سال رمضان آتا ہے لیکن ایک سالانہ رسم بن کر کہ اسے کم ہی لوگ اپنے اندرون میں مستقل تبدیلی لانے کا ذریعہ بنا پاتے ہیں۔ یکسانیت (monotony) کبھی چیزوں کو روایتی (ritualistic) بنا دیتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا رُبَّ صَائِمٍ لَیسَ لَهُ مِنْ صِیامِهِ إِلاَّ الْجُوعُ وَرُبَّ قَائِمٍ لَیسَ لَهُ مِنْ قِیامِهِ إِلاَّ السَّهَرُ۔ (بہت سے روزہ رکھنے والے ایسے ہیں کہ ان کو اپنے روزے سے بھوک کے سوا کچھ نہیں حاصل ہوتا، اور بہت سے رات میں قیام کرنے والے ایسے ہیں کہ ان کو اپنے قیام سے جاگنے کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔[۳])

مولانا علی میاں ندویؒ نے ایک دفعہ بہت اچھی بات کہی تھی۔ انھوں نے کہا تھا: اس وقت مسلمانوں کی بڑی کم زوری بد نیتی نہیں ہے بلکہ بے نیتی ہے۔ نیت قلب کی حضوری کا نام ہے۔[۴] نیت عبادت کے مقاصد پر نگاہ رکھنے کا نام ہے۔ نیت انی وجہت پڑھنے کا نام نہیں ہے بلکہ دل کی گہرائی سے، اس جذبے اور شعور کے ساتھ جائے نماز پر کھڑے ہونے کا نام ہے کہ میں نے ہر طرف سے یکسو ہو کر اپنے رخ کو خدا کی طرف پھیر دیا ہے اور اب اس کا بن گیا ہوں۔ دل کی گہرائی میں یہ پختہ نیت نہ ہو تو عبادت محض ایک رسم بن جاتی ہے۔ اب جب کہ امت میں عبادتوں کا شعور عام ہو گیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ سب سے زیادہ اس بے نیتی کو دور کرنے پر توجہ مرکوز کی جائے۔ عبادتوں کی روح کے احیا کی کوشش کی جائے۔ اس بات کی کوشش کی جائے کہ ہمارے مراسم عبودیت ہم کو اس اخلاقی و روحانی بلندی تک لے جائیں جو قرآن چاہتا ہے۔

رمضان ۱۴۴۱ھ

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر حالیہ رمضان کی اس خاص شکل میں ظہور پذیری کی حکمتوں

پر غور کیا جائے تو کئی اہم باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، ایک طرف امت اپنی تاریخ کے نازک دور سے گزر رہی ہے۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہماری بھرپور تربیت ہو اور ہم زبردست روحانی واخلاقی قوت سے مالامال ہو کر، اور قرآنی تعلیمات کا عملی نمونہ بن کر، اس دنیا کو بہتر بنانے میں اپنا رول ادا کر سکیں۔ پھر یہ رمضان اس طرح آرہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی صفات کا پوری قوت کے ساتھ ہمارے چاروں طرف ظہور ہو رہا ہے۔ خدا کا انکار کرنے والے اور خدا سے غافل انسان بھی رب کائنات کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا رمضان ہمارے لیے مقدر فرمایا ہے جو اب تک کے رمضانوں سے بالکل مختلف ہے۔

اس رمضان میں اہل ایمان کو یہ موقع مل رہا ہے کہ وہ رسمی یک رنگی (ritualistic monotony) کو توڑیں اور رمضان کے مقصد اور اس کی روح کی طرف پوری قوت اور یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہو جائیں۔ یہ ایک ایسا رمضان ہے جس میں بازار بند ہوں گے۔ ہوٹل بند ہوں گے۔ کھانے پینے میں لذت اندوزی کے مواقع ہر ایک کے لیے نسبتاً کم ہوں گے۔ ہم نے جو برسوں سے رمضان کو لذیذ سے لذیذ ڈشوں سے لطف اندوز ہونے کا مہینہ بنا دیا تھا، اس دفعہ اس کا موقع نہیں ہے۔ اس دفعہ شاپنگ کا موقع نہیں ہے۔ آباد بازاروں کی رونقوں سے لطف اندوز ہونے کا بھی موقع نہیں ہے۔ دعوتوں اور افطار پارٹیوں کا بھی موقع نہیں ہے۔ موقع ہے تو اس بات کا کہ ہم پوری یکسوئی سے، ہر طرف سے کٹ کر، رب کائنات کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اس کی نشانیوں پر، اس کے کلام پر، اور اس کی ذات پر اپنی توجہات کو فوکس کر دیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں کو اس دفعہ کام اور معاشی تگ ودو سے بھی فرصت حاصل ہے۔ ورک فرام ہوم کرنے والوں کے لیے اوقات پر زیادہ کنٹرول میسر ہے۔ ہم چاہیں تو بھرپور یکسوئی اور حضور قلب کے ساتھ اس رمضان کو گزار سکتے ہیں۔

رمضان المبارک کا ایک پہلو اجتماعی اور سماجی ہے اور ایک پہلو انفرادی ہے۔ ایک پہلو مراسم کا ہے، ایک پہلو اس کی روح، اسپرٹ اور مقاصد کا ہے۔ دونوں پہلوؤں کی اہمیت ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی تقویت کا سامان کرتے ہیں۔ دونوں مل کر ہی مکمل عبادت بنتے ہیں۔ لیکن شاید عملاً ہماری زندگیوں میں اجتماعی پہلو غالب ہو گیا تھا اور انفرادی پہلو کم زور ہوتا جا رہا تھا۔ مراسم کا پہلو غالب

ہو گیا تھا اور مقاصد اور اسپرٹ کا پہلو دب گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دفعہ اس عدم توازن کو دور کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔

ہم یہ رمضان کیسے گزاریں؟

آیئے اس رمضان کو اب تک کی زندگی کا بہترین رمضان بنادیں۔ اسے اپنی زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ بنادیں۔ حقیقی تقویٰ کی افزائش کا بے مثل ذریعہ بنادیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس ماہ میں رسول اللہ ﷺ نے پورے تیس دن کا بھی اعتکاف فرمایا ہے اور آخری عشرہ کا بھی اور بیس دن کا بھی۔ بے شک اس دفعہ اعتکاف کا موقع نہیں ہے۔ لیکن ہم سب اپنے گھروں میں بند ہیں۔ ہم چاہیں تو اس پورے مہینے کو اعتکاف کی کیفیت کے ساتھ گزار سکتے ہیں اور اعتکاف کی ایسی کیفیت کے ساتھ جو آج کل مسجدوں میں بھی میسر آنا مشکل ہے۔ بے شک اعتکاف تو مسجد ہی میں ہوتا ہے اور وہی مطلوب بھی ہے لیکن اس وقت اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی ہے کہ ہم گھروں پر رہیں تو ہم سوچیں کہ اس موقع کا کیسے بہترین استعمال ہوسکتا ہے۔ اور کیسے گھر پر اعتکاف کی سی یکسوئی، انہماک اور ارتکاز کے ساتھ ہم پورا مہینہ صرف کر سکتے ہیں۔ باجماعت تراویح سنت ہے، لیکن اس وقت کے حالات میں دین کی تعلیم یہی ہے کہ ہم تراویح گھر پر پڑھیں تو ہم کو دیکھنا ہے کہ کیسے ہم تنہائی میں، اس تراویح کو زیادہ خشوع وخضوع اور زیادہ حضوری اور توجہ وارتکاز کے ساتھ ادا کرنے کی مشق کر سکتے ہیں۔ اگر رمضان کے آخر میں ہم کو باجماعت تراویح ادا کرنے کا موقع مل جائے یا آئندہ سال میسر آئے تو ان شاء اللہ پھر مسجد میں بھی ہم اسی ارتکاز اور توجہ کے ساتھ نماز ادا کریں گے اور باہر کی رونقیں اور ہماہمی ہم کو غافل نہیں کر سکے گی۔ ہم اس دفعہ شب بیداری اور راتوں کے قیام کی روحانی کیفیت حاصل کریں۔ اور کوشش کریں کہ وہ مومنانہ کیفیت پیدا ہو جس کی منظر کشی اس طرح کی گئی ہے کہ:

> وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ ۔ إِنَّ الَّذِينَ عِندَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيُسَبِّحُونَهُ وَلَهُ يَسْجُدُونَ۔ (اے نبی ﷺ، اپنے رب کو صبح وشام یاد کیا کرو دل ہی دل میں زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ تم ان لوگوں میں سے

نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ جو فرشتے تمہارے رب کے حضور تقرب کا مقام رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آکر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں، اور اس کے آگے جھکے رہتے ہیں۔ سورہ اعراف، آیت ۲۰۵،۲۰۶)

ہم زیادہ ارتکاز اور یکسوئی کے ساتھ اور بھرپور وقت دیتے ہوئے قرآن پر غور کریں۔ نبی کریم ﷺ کے قیام لیل کی منظر کشی ایک صحابی نے اس طرح کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ تہجد کی نماز میں کھڑے ہوئے، اور ایک آیت کو صبح تک دہراتے رہے، اور وہ آیت یہ تھی:

إن تعذبهم فإنهم عبادك وإن تغفر لهم فإنك أنت العزيز الحكيم (اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو ان کو بخش دے، تو تو عزیز (غالب)، اور حکیم (حکمت والا) ہے، سورہ مائدہ، آیت ۱۱۸)۔[۵]

قیام لیل کی یہ اسپرٹ، اللہ کے کلام پر اس طرح غور و فکر اور اس سے راست تعلق اور بات چیت کی کیفیت، ہم اس رمضان میں زیادہ یکسوئی کے ساتھ پیدا کر سکتے ہیں۔ ہماری کوشش ہو کہ ہم یہ پیدا کریں، قرآن کے ذریعے اور راتوں کے طویل قیام میں تلاوت قرآن کے ذریعے اللہ سے سرگوشی کرنے کا لطف و سرور حاصل کریں، قرآن کو اپنی ذاتی زندگی کا گائیڈ اور رہبر و رہ نما بنائیں، اسے پڑھیں، سمجھیں، قرآن کی روشنی میں اپنا بھرپور جائزہ لیں، ایک ایک گناہ ایک ایک غلطی کو یاد کر کے، اس پر شرمندگی و ندامت کے مخلص جذبات پیدا کر کے غفور و رحیم کے دربار میں مغفرت طلبی اور توبہ کے ہاتھ پھیلائیں، ایک ایک خواہش، ایک ایک مراد اور ایک ایک ضرورت کو اللہ کے سامنے عاجزانہ دعا کے ذریعے پیش کریں، وہ سب کچھ مانگیں جو ہمارے لیے دنیا کی کام یابی کے لیے مطلوب ہے اور آخرت کی کام یابی کے لیے درکار ہے۔

ہمارے بعض بھائی ان دنوں، معاشی مشکلات سے گزر رہے ہوں گے۔ ایسی تنگیوں سے جن کا اس سے پہلے انھوں نے کبھی سامنا نہیں کیا تھا۔ جن لوگوں کو اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے وہ بھی سب کچھ رکھتے ہوئے طرح طرح کی مشکلات، تنگیوں اور الجھنوں سے دوچار ہوں گے۔ اسے بھی ہم اپنی تربیت کا سامان بنائیں۔ رمضان کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ اہل ایمان کے اندر سخت کوشی پیدا کرتا ہے، مشکل حالات میں رہنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، آرام دہ معمولات کو توڑنے اور اس

سے ہٹ کر زندگی گزارنے کی لیاقت پیدا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دفعہ رمضان میں اس تربیت کو بھی شدید تر کر دیا ہے، تاکہ ہم زیادہ سخت جان بن کر نکلیں۔ ہم اسے اپنی تربیت کا ذریعہ سمجھیں اور بنائیں۔

رمضان مواسات اور ہم دردی کا مہینہ ہے۔ ہم روزہ کے ذریعے بھوک پیاس کا احساس ہر سال کرتے ہیں۔ لیکن اس دفعہ یہ احساس اس طرح کر رہے ہیں کہ ہماری نظروں کے سامنے آدم کے لاکھوں کروڑوں بیٹے بیٹیاں، بھوک سے تڑپ اور سسک رہے ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج بھی کتنی محرومی ہے، کتنی بے بسی و لاچاری ہے، غربت و فاقہ کشی کا کیا عالم ہے اور اللہ کے فراہم کردہ وسائل کی بہتات کے باوجود کیسے اللہ کے بندے ان وسائل سے محروم کیے جا رہے ہیں اور دنیا سے اس ظلم کو ختم کرنے کے لیے اللہ کے دین کے حاملین کو ابھی کیا کچھ اور کتنا کچھ کرنا باقی ہے۔

انسان کا مزاج اور اس کی شخصیت مشکل حالات میں بے نقاب ہوتی ہے۔ یہ رمضان ایسے حالات میں آ رہا ہے جب ہم نے دنیا اور عالم انسانیت کو اس آفت کے حوالے سے زیادہ بہتر طور پر سمجھا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمام تر سائنسی ترقیوں کے باوجود، الحاد و خدا بیزاری کے تمام فلسفوں کے باوجود انسان کا ضمیر آج بھی حق کا پیاسا ہے۔ بے شک بعض شقی القلب ایسے بھی ہیں جو ان حالات کو مذہب اور خدا کی شکست قرار دے رہے ہیں۔ نعوذ باللہ۔ لیکن دنیا بھر کے چھوٹے بڑے لوگوں کے بیانات، سوشل میڈیا پیغامات وغیرہ کا سرسری جائزہ یہ بتاتا ہے کہ اس آفت نے عام طور پر انسانوں کو اپنی کم زوری کا احساس دلایا ہے۔ خدا کی طرف پلٹنے اور اس کی طاقت و قدرت کے آگے سرنگوں ہونے کے جذبے کی افزائش کی ہے۔ انسانیت یقیناً اس عظیم آزمائش سے بہت کچھ سیکھے گی اور اس کا رویہ اس آفت کے بعد ضرور بدلے گا۔ ان حالات میں اللہ کے دین کے علم برداروں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ پیاسی انسانیت کے سامنے کائنات کے خالق و مالک کا پیغام پہنچانے کی کوششوں کو تیز تر کریں، انھیں خدا کی طرف بلائیں، عدل و انصاف کی طرف اور اعتدال و توازن کی طرف بلائیں۔ امید کی جاتی ہے کہ ان شاء اللہ کووڈ ۱۹ کے بعد کی دنیا ان باتوں کو سننے کی بہتر پوزیشن میں ہوگی۔

اس آفت کے بعد زیادہ بڑے مواقع، زیادہ بڑی ذمہ داریاں، زیادہ بھاری کام ہمارے منتظر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس دفعہ ایک منفرد قسم کے رمضان سے ہماری تربیت کا سامان پیدا کیا ہے۔

ہماری بھرپور کوشش ہو کہ اس ماہ تزکیہ سے ہم اچھی طرح تیار ہو کر نکلیں اور ان عظیم ذمہ داریوں کی طرف زیادہ قوت کے ساتھ متوجہ ہوں جو ہماری منتظر ہیں۔ سورہ مزمل کی ابتدائی آیات کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ یہ اس وقت نازل ہوئیں جب دعوت دین کے سلسلہ میں عظیم چیلنج آپ ﷺ کو درپیش تھے۔ ان حالات میں حکم دیا گیا کہ

> قُمِ اللَّيۡلَ إِلَّا قَلِيلًا ۔ نِّصۡفَهُۥٓ أَوِ انقُصۡ مِنۡهُ قَلِيلًا ۔ أَوۡ زِدۡ عَلَيۡهِ وَرَتِّلِ الۡقُرۡآنَ تَرۡتِيلًا ۔ إِنَّا سَنُلۡقِي عَلَيۡكَ قَوۡلًا ثَقِيلًا ۔ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيۡلِ هِيَ أَشَدُّ وَطۡئًا وَأَقۡوَمُ قِيلًا ۔ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِيلًا ۔ وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلۡ إِلَيۡهِ تَبۡتِيلًا (رات میں قیام کر مگر تھوڑا حصہ۔ آدھی رات یا اس میں سے کچھ کم کر دو۔ یا اس پر کچھ زیادہ کر لو اور قرآن کی تلاوت کرو ٹھیر ٹھیر کر۔ ہم تم پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ بے شک رات میں اٹھنا دل جمعی اور فہم کلام کے لیے نہایت خوب ہے۔ دن کے اوقات میں تو تمہارے لیے بہت مصروفیات ہیں۔ سورہ مزمل، آیت ۲ تا ۷)

ایک ایسے دور میں جب کہ امت کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں، اللہ تعالیٰ ہماری تربیت کا خصوصی سامان کر رہا ہے۔ ہم اس رمضان کو اس کی حقیقی اسپرٹ کے ساتھ گزارنے کی کوشش کریں تو ان شاء اللہ یہ مہینہ ۱۴۴۱ ہجری کا یہ ماہ رمضان امت کے لیے ماہِ انقلاب یعنی ایک اندرونی صالح انقلاب کا ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ خدا کرے ایسا ہو جائے۔

(زندگی نو، مئی ۲۰۲۰)

حواشی و حوالہ جات

۱۔ معارف القرآن، سورہ روم کی آیت ۴۱ کی تشریح

۲۔ صحیح البخاری، باب فضل من قام رمضان

۳۔ سنن ابن ماجه، مَا جَاءَ فِي الْغِيبَةِ وَالرَّفَثِ لِلصَّائِمِ

۴۔ ہفت روزہ ندائے ملت، ۱۵ جنوری ۱۹۶۵

۵۔ سنن ابن ماجه، حديث ۱۳۵۰

نصب العین پر ارتکاز

کسی انسانی گروہ کی کام یابی و سربلندی جن خصوصیات پر منحصر ہوتی ہے، اُن میں سرفہرست اس کا مقصد و نصب العین ہے۔ نصب العین (goal یا objective) اس بات کا نام ہے کہ نگاہوں کے سامنے ایک واضح ہدف ہو، یعنی وہ منزل جہاں پہنچنا ہے وہ اچھی طرح معلوم ہو۔ گروہ کے تمام ارکان کا اس پر اتفاق ہو، اسی پر ان کا ارتکاز اور یکسوئی (فوکس) ہو، اسی کو بنیاد بنا کر ہر قدم اٹھایا جائے، اسی سے سمتِ سفر کا بھی تعین ہو اور راہِ عمل کا بھی۔ جدید علم انتظام اور علم قیادت میں اسٹریٹجی (strategy) اور اسٹریٹجک مینجمنٹ (strategic management) کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اسٹریٹجی کے بغیر کسی اجتماعیت کو بامعنی اور باشعور اجتماعیت (mature organisation) سمجھا ہی نہیں جاتا۔ اسٹریٹجی میں مقصد و نصب العین کو مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ مقصد و نصب العین، اعتقادات یعنی بلیف سسٹم (belief system) کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر کسی ادارے یا اجتماعیت کے عقائد کچھ اور ہوں اور ہدف کچھ اور، تو یہ ٹکراؤ اُسے کام یاب ہونے نہیں دیتا۔ اسی طرح اسٹریٹجی کا ایک اہم حصہ اجتماعیت کی بنیادی اقدار (core values) ہوتی ہیں۔ ان قدروں کا تعلق عقائد سے ہوتا ہے اور یہ مقصد و نصب العین کی سمت آگے بڑھنے میں روشنی کا کام کرتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کی کام یاب اور باشعور اجتماعیتوں کے پاس اپنے عقائد، وژن اور قدروں یعنی کور ویلیوز کا نہایت مستحکم نظام پایا جاتا ہے، ان کا ایک دوسرے سے گہرا ارتباط ہوتا ہے اور اجتماعیت پر ان کی حکم رانی ہوتی ہے۔

وژن یا مقصد و نصب العین ہمارے کاموں اور اقدامات میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے، انھیں

سمت عطا کرتا ہے، معنویت فراہم کرتا ہے۔ اسی سے ہر فیصلہ و اقدام کے لیے بنیاد اور محرک فراہم ہوتے ہیں۔ جائزہ و احتساب کے لیے ٹھوس پیمانے ملتے ہیں۔ مسلسل حرکت و پیش قدمی کی تحریک حاصل ہوتی رہتی ہے۔ مقصد و نصب العین کے ذریعے اہم اور غیر اہم میں فرق کی کسوٹیاں میسر آتی ہیں۔ یہ ہمیں راستے کی رکاوٹوں میں الجھنے نہیں دیتا، ہماری نگاہوں کو فوری اور مختصر المیعاد مسائل کی تنگ نظری کے مقابلے میں طویل المیعاد مفادات کی وسعت نظری، بصیرت اور گہرائی عطا کرتا ہے۔ مشکلات و مصائب کو ہمارے اعصاب پر سوار ہونے نہیں دیتا۔ وہ ہماری صفوں کو منظم و متحد رکھتا ہے۔ اختلاف کے باوجود اتحاد کا جواز فراہم کرتا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ پریشان کن صورت حال کا اہم ترین سبب، ہماری نظر میں، ایسے صاف و شفاف نصب العین کا فقدان ہے۔ ہم اگلی سطروں میں واضح کریں گے کہ ہماری کام یابی، سربلندی اور استحکام کے لیے، نیز موجودہ احوال کی پیچیدگیوں کا کام یابی سے سامنا کرنے کے لیے واضح نصب العین کی کتنی اہمیت ہے؟ ایسا نصب العین جو امت کی ہر آنکھ کا خواب بن جائے، امت کے ہر فرد کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا اور آرزو بن جائے، ہمارے تمام اداروں اور جمعیتوں کا اصل مطمح نظر ہو جائے۔ جس پر نگاہ جما کر دوڑ لگانے میں ہمیں زندگی کی معنویت اور لطف و سرور کا احساس ہو، جو ہمارے اعصاب پر سوار ہو جائے۔ جو ہم پر چھا جائے، اس طرح کہ اُسے پانے کی آرزو اور اس کے وصل کی تمنا ہمیں دنیا کے ہر غم سے بے نیاز کر دے۔

میرا کمالِ شعر بس اتنا ہے اے جگرؔ
وہ مجھ پہ چھاگئے، میں زمانے پہ چھاگیا

واقعہ یہ ہے کہ ایسے واضح نصب العین کے بغیر ایک اجتماعی گروہ (قوم یا ملت) ہمیشہ ادھورا اور بے بنیاد رہتا ہے۔ وہ ایک کٹی پتنگ بن جاتا ہے۔ اگر ہم واضح ملّی نصب العین سے محروم رہیں تو اس محرومی کی وجہ سے ہم نہ صرف بے سمت اور بے معنی ہو جاتے ہیں بلکہ نہایت کم زور (vulnerable) بھی ہو جاتے ہیں۔ ترقی، جہد و عمل، اور مقابلہ و مسابقہ کے اجتماعی داعیات باقی

نہیں رہتے۔ ایک ایسی فٹ بال ٹیم کا خیال کیجیے جو گول کا تصور فراموش کر چکی ہے۔ اس کے ہر کھلاڑی کے پاس اپنے لیے گوشہ عافیت تلاش کرنے یا زیادہ سے زیادہ بے دلی کے ساتھ بال کو ادھر ادھر لڑھکا دینے کے سوا اور کیا کام باقی رہ جاتا ہے؟ بغیر کسی گول کے، ٹیم کے تمام ارکان اگر من چاہے طریقہ سے بال کو ڈھکیلتے رہیں تو قدم قدم پر ٹکراؤ اور الجھاؤ بھی اس عمل کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے، اور ایسی بے معنی محنت گھنٹوں کرتے رہنے کے باوجود کسی نتیجہ کا نہ نکلنا بھی عین فطری بات ہے۔ یہی حال اُن قوموں، ملتوں اور اجتماعی گروہوں کا ہوتا ہے جن کے پاس کوئی واضح نصب العین نہیں ہوتا۔ وہ گوشہ ہائے عافیت میں رہنے لگتے ہیں، ان کو کش مکش سے پریشانی ہونے لگتی ہے اور میدان جہد کی سخت کوشیاں، طبع نازک پر گراں محسوس ہونے لگتی ہیں۔ ان کی صفیں ہمیشہ منتشر اور ان کی کوششیں بے معنی و بے نتیجہ رہتی ہیں۔

قرآن مجید کی رہ نمائی

قرآن مجید نے متعدد جگہوں پر یہ بات واضح کی ہے کہ اہل ایمان کی کام یابی کے لیے صحیح ارتکاز ضروری ہے۔ ان کا ایمان یعنی بلیف سسٹم مستحکم ہونا چاہیے اور ایمان کی ایک اہم علامت یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جدوجہد اُن کی زندگیوں کا اصل مطمح نظر بننا چاہیے۔ قرآن مجید نے صرف اخروی نجات کے لیے ہی نہیں بلکہ دنیا میں کام یابی، امن و سکون کے لیے بھی پختہ ایمان کو پہلی شرط قرار دیا ہے۔

قرآن میں بہت صاف صاف کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی کام یابی ایمان کے ساتھ مشروط ہے۔

> وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۳۹)

اسی طرح یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ معاشی ترقی کا اصل راز بھی ایمان کی پختگی اور ایمان کے عملی تقاضوں کی تکمیل یعنی تقویٰ میں پوشیدہ ہے۔

وَلَو اَنَّ اَهلَ القُرٰی اٰمَنُوا وَاتَّقَوا لَفَتَحنَا عَلَیهِم بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالاَرضِ
(اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین
سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔ سورہ اعراف، آیت ۹۶)

یا نوح علیہ السلام نے اللہ کی جانب سے ضمانت دی کہ اگر ان کے مخاطبین اللہ کی طرف رجوع کریں تو یُرسِلِ السَّمَآءَ عَلَیکُم مِّدرَارًا وَّیُمدِدکُم بِاَموَالٍ وَّبَنِینَ وَیَجعَل لَّکُم جَنّٰتٍ وَّیَجعَل لَّکُم اَنهٰرًا (وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا۔ تمہیں مال اور اولاد سے نوازے گا، تمہارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کر دے گا۔ سورہ نوح، آیت ۱۲،۱۱)

حتیٰ کہ اہل ایمان کے لیے امن وامان کی ضمانت بھی ایمان اور عمل صالح کے نتیجہ ہی میں ملتی ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِینَ اٰمَنُوا مِنکُم وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَستَخلِفَنَّهُم فِی الاَرضِ کَمَا استَخلَفَ الَّذِینَ مِن قَبلِهِم وَلَیُمَکِّنَنَّ لَهُم دِینَهُمُ الَّذِی ارتَضٰی لَهُم وَلَیُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعدِ خَوفِهِم اَمنًا (اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے، اور اُن کی (موجودہ) حالت خوف کو امن سے بدل دے گا۔ سورہ نور، آیت ۵۵)

قرآن نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ایمان کی کم زوری اور خدا سے غفلت، نامرادی و پسپائی کا باعث بنے گی۔ وَمَن اَعرَضَ عَن ذِکرِی فَاِنَّ لَهٗ مَعِیشَةً ضَنکًا (اور جو میرے 'ذِکر' (درسِ نصیحت) سے منہ موڑے گا اس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی۔ سورہ طٰہٰ، آیت ۱۲۴)

قرآن مجید نے اپنے اس اصول کے حق میں متعدد تاریخی واقعات کی بھی شہادت دی ہے۔ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَریَةً کَانَت اٰمِنَةً مُّطمَئِنَّةً یَّاتِیهَا رِزقُهَا رَغَدًا مِّن کُلِّ مَکَانٍ فَکَفَرَت بِاَنعُمِ

اللہِ فَأَذَاقَهَا اللهُ لِبَاسَ الجُوعِ وَالخَوفِ بِمَا كَانُوا يَصنَعُون (اللہ ایک بستی کی مثال دیتا ہے، وہ امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہی تھی اور ہر طرف سے اس کو بفراغت رزق پہنچ رہا تھا کہ اس نے اللہ کی نعمتوں کا کفران شروع کر دیا تب اللہ نے اس کے باشندوں کو ان کے کرتوتوں کا یہ مزا چکھایا کہ بھوک اور خوف کی مصیبتیں ان پر چھا گئیں۔ سورہ نحل، آیت ۱۱۲)

ہر مضبوط عقیدہ سے خود بخود زندگی کا ایک متعین نصب العین جنم لیتا ہے۔ جب آدمی کا ایمان اللہ پر، اُس کی کتاب پر، اُس کے رسولوں پر مضبوط و مستحکم ہوتا ہے تو خدا اور رسول کی تعلیمات، دنیا اور دنیا کے احوال کو درست کرنے کا ایک وژن بھی فراہم کرتی ہیں۔ مضبوط ایمان، ہماری توجہات کو اسی وژن اور نصب العین پر مرکوز کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد جگہوں پر عملِ صالح کے ساتھ اللہ کی راہ میں اور اسلام کے ہوئے مقصد و نصب العین کی خاطر جدوجہد کو بھی ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا گیا ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ مومنین کی خصوصیات میں، اللہ کی راہ میں جدوجہد کو اہم صفت کے طور پر بیان کیا ہے۔ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللهِ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُون (حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انھوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہی سچے لوگ ہیں۔ سورہ حجرات، آیت ۱۵)

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ

قرآن مجید نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کو اہل ایمان کے لیے نمونہ اور ماڈل قرار دیا ہے۔ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ (تم لوگوں کے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے۔ سورہ ممتحنہ، آیت ۴)

سیدنا ابراہیم کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی یکسوئی اور ارتکاز تھا۔ ان کے بارے میں کہا گیا کہ وہ مسلمِ حنیف تھے۔ (سورہ آل عمران، آیت ۶۷) وہ ہر طرف سے یکسو ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ (سورہ انعام، آیت ۷۹) ان کی حنیفیت کی مزید تشریح کرتے ہوئے قرآن نے

کہا کہ اپنی پوری زندگی کو خلیل اللہؑ نے اللہ کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ان کی ساری عبادتیں بھی اللہ کے لیے تھیں اور ان کا جینا اور مرنا بھی اللہ کی خاطر ہی تھا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کا دیا ہوا مشن اُن کی زندگی کی واحد دل چسپی تھا۔ (سورہ انعام، آیت ۱۶)

ابراہیمؑ کا مشن دعوت توحید تھا۔ اس کے لیے پہلے اپنے وطن میں ہر طرح کی آزمائشیں اور قربانیاں آپؑ نے خندہ پیشانی سے قبول کیں۔ پھر اسی مقصد کی خاطر ہجرت کی اور مصر، شرق اردن، فلسطین اور حجاز میں اپنی دعوتی سرگرمیوں کے مراکز بنائے۔ اپنے خاندان کے لوگوں کو یہاں متعین کیا۔ اس مشن کے تسلسل کے لیے اولاد کی تمنا کی۔ اپنے بیٹے اسماعیل اور بیوی کو لق ودق صحرا میں بسانا گوارا کیا۔ اللہ کے گھر اور دعوتِ توحید کے مرکز کی تعمیر کی۔ بیٹے کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور زندگی بھر کی جہد مسلسل کے بعد جب وفات کا وقت آیا تو اِس تمنا و دعا کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے کہ اُن کی اولاد کے ذریعے اس مشن کے تسلسل کے لیے ایک پوری اجتماعیت یعنی امت وجود میں آئے۔ (سورہ بقرہ، آیت ۱۲۸)

اس طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا جو نمونہ سامنے آتا ہے وہ ایک ایسے مومن صادق اور مسلم حنیف کا ہے جو توحیدِ خالص پر پختہ ایمان رکھتا تھا اور دعوت اِلی اللہ اُس کی زندگی کا نصب العین اور اُس کی تمام توجہات، دل چسپیوں اور کوششوں کا فوکس تھا۔

مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ یکسو ہو کر ابراہیم علیہ السلام کے اسی طریقہ کار کی پیروی کریں اور اس پر فوکس کر لیں۔ وَمَنۡ اَحۡسَنُ دِيۡنًا مِّمَّنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا ‌ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبۡرٰهِيۡمَ خَلِيۡلًا (اس شخص سے بہتر اور کس کا طریق زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویہ نیک رکھا اور یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقے کی پیروی کی، اس ابراہیم کے طریقے کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنا لیا تھا۔ سورہ نساء، آیت ۱۲۵)

نصب العین پر ارتکاز: اصل طاقت

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ ایمان دنیا اور آخرت دونوں جگہ ثبات (stability) عطا کرتا

ہے۔ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِينَ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ (ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قول ثابت کی بنیاد پر دنیا اور آخرت، دونوں میں ثبات عطا کرتا ہے، اور ظالموں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے اللہ کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔ سورہ ابراہیم، آیت ۲۷)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان و یقین بذات خود ایک قوت ہے اور اس کے مقابلے میں نفاق ایک کمزوری ہے۔ ایمان فرد کو اور قوموں کو ارتکاز عطا کرتا ہے۔ اُن کی ذہنی و عملی قوتیں مرکوز ہو جاتی ہیں۔ اس ارتکاز سے ان کی ہر قوت زیادہ موثر ہونے لگتی ہے۔ اس کے مقابلے میں تشکیک (agnostism) نفاق (hypocrisy) اور تناقض (ambivalence) نفسیاتی کمزوریاں ہیں۔ ان سے ہمارا لاشعور کنفیوژن کا شکار ہو جاتا ہے۔ قوتیں منتشر ہو جاتی ہیں۔ کارکردگی کے لیے کوئی طاقت ور داعیہ باقی نہیں رہتا۔

حالیہ دنوں میں مختلف شعبوں کے کئی تجربات نے ایمان و یقین کی اس طاقت کو ثابت کیا ہے۔ تعلیمی نفسیات میں پگمیلین اثر (Pygmalion effect) ایک بڑا اہم نظریہ ہے۔ اگر طالب علم کے اندر یہ یقین پیدا کیا جائے کہ وہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتا ہے تو اس کی کارکردگی حیرت انگیز طور پر بڑھ جاتی ہے۔ بلکہ اگر ٹیچر کے اندر یہ یقین پیدا ہو جائے کہ فلاں طالب علم زیادہ ذہین ہے تو اس کا اثر بھی اُس طالب علم کی کارکردگی پر پڑتا ہے اور اس کی تعلیمی کارکردگی غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح، میڈیکل پریکٹس میں پلیسیبو ایفکٹ (placebo effect) کی تھیوری کثرت سے استعمال ہوتی ہے۔ یعنی اگر سادہ شکر کی گولیاں بھی مریض کو کھلا دی جائیں لیکن اس کو یہ مضبوط یقین ہو کہ اس سے اس کا مرض دور ہو سکتا ہے تو بہت سی صورتوں میں صرف اس یقین کی وجہ سے ان بے اثر سادہ گولیوں سے وہ صحت یاب ہو جاتا ہے۔

اس بحث سے ہماری کمزوری کا سبب معلوم ہو جاتا ہے۔ اگر ہم اسلام کو بھی مانیں اور اس سے متصادم افکار کے بھی اثرات قبول کرتے رہیں، یا اسلام کو سچ مانیں لیکن جدید دنیا میں اس کے

قابل عمل ہونے پر تذبذب کا شکار ہوں، یا اسلام کو مانیں لیکن ہمارا رویہ اور عمل اس کے مطابق نہ ہو یا ہمارا ہدف اور نصب العین وہ نہ ہو جو اسلام دیتا ہے، تو یہ ساری دورنگیاں اور تناقض کم زوری پیدا کرتا ہے۔ یہ کم زوری ہر میدان میں ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔ ایمان کی یہ کم زوری آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی نقصان پہنچاتی رہتی ہے۔ اس کا اثر امت کی اجتماعی نفسیات پر پڑتا ہے اور پھر یہ اثر افراد کو بھی کم زور بناتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہم تعلیم میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ہماری معاشی سرگرمیاں بے فیض ہوجاتی ہیں۔ سیاسی طور پر بے وزن ہوجاتے ہیں۔ اور بالآخر ایک کم زور اور ضعیف گروہ بن کر استحصال اور ظلم کا شکار بنتے رہتے ہیں۔

اسلامی تحریکوں کے مفکرین نے اس بات سے خبردار کیا تھا کہ اسلامی معاشرے یوروپی افکار و نظریات قبول کر کے ترقی نہیں کرسکتے۔ یوروپ اور امریکہ میں تومادہ پرست سیکولر فکر وہاں کی قوموں کا 'دین' ہے۔ اس پر انھیں ایمان کامل ہے۔ اور یہ ایمان (چاہے غلط مفروضوں پر سہی) ان کی طاقت بن گیا ہے۔ لیکن ان اجنبی تصورات کو آپ اسلامی معاشروں میں درآمد کریں، جہاں مسلمانوں کے ایمان ویقین سے یہ افکار متصادم ہیں، تو اس کے نتیجہ میں کسی بھی بات پر ان کو مکمل اطمینان حاصل نہ ہوگا۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

یہ کیفیت نفاق اور تناقض کو جنم دیتی ہے جو بہت بڑی اجتماعی کم زوری بلکہ کم زوریوں کا اصل سرچشمہ ہے۔ چنانچہ تجربات سے بھی یہی معلوم ہوا کہ ترکی جیسی مجاہد قوم، مغربی طرز زندگی کے تحت بالکل بے اثر ہوکر رہ گئی تھی اور جب اس کی اجتماعی زندگی کا رشتہ دوبارہ اسلام کے ساتھ قائم ہوا تو اس کے تعلیمی، سماجی، معاشی، تجارتی، تہذیبی، سیاسی، عسکری ہر طرح کے عروج کا آغاز ہوا۔

اسی طرح کوئی قوم جو قوم پرستی کے مغربی تصورات میں یقین رکھتی ہے، وہ قومی ترقی اور قومی عروج کو ہدف بنا کر ترقی کرسکتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کا دین اور ان کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ ایک قوم نہیں

ہیں بلکہ ایک دین کی علم بردار امت ہیں۔ محض قومی ترقی کا نصب العین ان کے بلیف سسٹم سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتا اس لیے وہ کبھی بھی ان کا اصل مقصد اور مطمح نظر نہیں بن سکتا۔

مقصد و نصب العین پر ارتکاز اور مشکلات حیات

مقصد و نصب العین پر ارتکاز انسانوں اور انسانی گروہوں کو وقتی مسائل و مشکلات میں نہ الجھنے دیتا ہے اور نہ ان سے پریشان ہونے دیتا ہے۔ جب نگاہیں منزل پر ٹکی ہوں تو راستے کے معمولی مسائل بے معنی ہوکر رہ جاتے ہیں۔ جب ہم منزل پر نگاہیں جماکر دور کے سفر پر نکل جاتے ہیں تو راستے کی ناہمواریاں، رکاوٹیں، گڑھے اور پتھر ہماری توجہات کا مرکز کبھی نہیں بنتے۔ ہم اُن سے اتنا ہی تعرض کرتے ہیں جتنا سفر کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ہماری توجہ راستے سے زیادہ منزل پر ہوتی ہے۔ منزل پر پہنچنے کے لیے دشوار گزار راستہ ہی ضروری ہو تو راستے کی دشواری کی ہم پروا نہیں کرتے۔ اس کے برخلاف جب ہمارا سفر بے مقصد اور بے منزل ہوتا ہے، یعنی ہم یونہی چہل قدمی کے لیے چل رہے ہوتے ہیں تو راستے کا ہر چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ ہمیں متوجہ کرتا ہے۔ راستہ ہی ہماری توجہات کا مرکز و محور بن جاتا ہے۔ راستے کی ناہمواری، ہم کو پریشان کرتی ہے اور ہم چہل قدمی کے لیے ہموار راستہ تلاش کرتے ہیں۔ راستے کا ہر پھول بھی ہمیں متوجہ کرتا ہے اور ہر کانٹا بھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ راستے کی الجھنوں کا شکار ہوجانا سفر کے غیر اہم، بے معنی اور بے منزل ہونے کی علامت ہے۔

مقصد و نصب العین اور بامعنی زندگی کی اہمیت بیان کرنے کے لیے اکثر ہولوکاسٹ کے شکار، آسٹریائی یہودی ڈاکٹر اور ماہر علم الاعصاب (neurologist)، وکٹر فرینکل (Viktor Frankl) کی مثال دی جاتی ہے۔ وکٹر فرینکل اور اُس کا پورا خاندان نازی جرمنی کے عقوبت خانے (concentration camp) میں قید تھا جہاں بھوک، سردی اور ظلم سہتے سہتے، اُس کی ماں، باپ بھائی اور اس کی محبوب بیوی موت کے شکار ہوگئے۔ اُس کی زندگی بھر کی سائنسی تحقیقات پر مبنی مسودے اس سے چھین لیے گئے۔ اس نے خود بے پناہ مظالم سہے لیکن

جرأت و حوصلے کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔ اس عقوبت خانے میں اس نے مختلف افراد کو اذیتوں کا مختلف طریقوں سے سامنا کرتے دیکھا۔ کچھ لوگ وہ تھے جو بہت جلد زندگی سے مایوس ہو گئے اور موت کو ترجیح دینے لگے جب کہ کچھ افراد وہ بھی تھے جنھوں نے غیر معمولی حوصلہ کے ساتھ اذیتوں اور مظالم کا مقابلہ کیا۔ اس نے دونوں طرح کے لوگوں کے رویّوں پر اپنے علم الاعصاب اور علم النفس کی معلومات اور تجربات کی روشنی میں غور کرنا شروع کیا۔ ان تجربات اور مشاہدوں نے اُسے علم نفسیات کی تیسری اہم ترین تھیوری تک پہنچایا۔

سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) کے نزدیک زندگی کا اصل محرک مسرت کی خواہش (will to pleasure) ہے، جب کہ الفریڈ اڈلر (Alfred Adler) کے نزدیک طاقت کی خواہش (will to power) ہے۔ ان دونوں کے مقابلے میں، فرینکل کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی کی اصل، معنویت کی خواہش (will to meaning) ہے۔ اسی بنیاد پر اس نے نفسیاتی علاج کا ایک اہم طریقہ لوگو تھراپی (logo therapy) ایجاد کیا۔ اس کے مطابق اگر انسانی زندگی، معنویت سے خالی ہو تو ہر چھوٹی چیز زندگی کو پیچیدہ بنادیتی ہے اور معنویت یعنی زندگی کا مقصد و ہدف، انسان کو زندہ رہنے اور جدوجہد کرنے کی آرزو، عمل کی ترغیب، ترقی کا محرک اور مشکلات کا سامنا کرنے کا غیر معمولی حوصلہ فراہم کرتا ہے۔ فرینکل کی کتاب 'انسان کی جستجوے معنی (Man's Search of Meaning)' دنیا کی مقبول ترین اور بااثر ترین کتابوں میں سے ایک ہے اور کئی زبانوں میں کروڑوں کی تعداد میں چھپ چکی ہے۔ نیطشے (Friedrich Nietzsche) کے مشہور قول کو اس نے اپنی تھیوری کی بنیاد بنایا کہ:

He who has a why to live can bear with almost any how.

جس کے پاس زندگی کی کوئی وجہ اور مقصد موجود ہے وہ زندگی کی ہر مشکل اور مسئلے سے آسانی سے گزر سکتا ہے۔

مسائل اور مشکلات اس وقت پیروں کی بیڑیاں بن جاتے ہیں جب زندگی کے سامنے کوئی

بڑا کیوں (a why to live) یعنی کوئی بڑا مقصد نہیں ہوتا۔ ہم اپنے عام مشاہدہ میں بھی دیکھتے ہیں کہ لوگ جب ریٹائرڈ ہوتے ہیں، اور زندگی کا کوئی مصرف ان کے پاس نہیں ہوتا تو ان کی صحت تیزی سے گرنے لگتی ہے۔ جو بزرگ زندگی کو بامعنی بنالیتے ہیں اور بزرگی میں بھی کوئی اہم اور نفع بخش مصروفیت انھیں میسر آجاتی ہے، وہ خوش اور صحت مند رہتے ہیں۔ یہ بات جس طرح افراد کے لیے درست ہے، اسی طرح قوموں کے لیے بھی ضروری ہے۔ کسی اجتماعی نصب العین کے بغیر ہمارا اجتماعی وجود بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے اور کم زور ہوجاتا ہے۔ طاقت و قوت، ترقی اور عروج و سربلندی کے لیے ضروری ہے کہ ایک اعلیٰ اجتماعی ہدف ہماری نگاہوں کے سامنے رہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی صورت حال

مسلمانوں کا مقصد و نصب العین کیا ہونا چاہیے؟ اس سلسلہ میں قرآن و حدیث کی تعلیمات اس قدر واضح ہیں کہ اس میں کسی دو رائے کی گنجائش نہیں ہے۔ تحریک اسلامی نے اقامت دین کو یعنی مکمل دین کے قیام کو اپنا نصب العین بنایا ہے۔ یہ امت مسلمہ کا حقیقی اور مکمل نصب العین ہے۔ امت کے بعض طبقات اس اصطلاح اور اس کی تفصیلات کے بارے میں مختلف رائے بھی رکھتے ہیں۔ لیکن، ہمارے خیال میں، کم از کم اس بات میں نہ کوئی اختلاف رائے ہے نہ اس کی کوئی گنجائش ہے کہ مسلمانوں کی اصل حیثیت داعی الی اللہ کی ہے اور اس حیثیت میں ان کا اصل کام اور وژن، اسلام کی دعوت ہے۔ اس بات کی درج ذیل تفصیلات پر بھی بڑی حد تک اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔

- ❑ اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچانا۔ مسلمان اس ملک میں اسلام کے داعی ہیں۔ انھیں ملک کی آبادی کو اسلام کے پیغام سے متعارف کرانا ہے اور دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دینا ہے۔
- ❑ اپنے معاشرہ کو مثالی اسلامی معاشرہ بنانا۔ انھیں اپنی اور اپنے معاشرہ کی اصلاح و تربیت پر اس طرح توجہ دینی ہے کہ وہ ایک مثالی اسلامی سوسائٹی بن جائیں اور ان کا اجتماعی و انفرادی کردار اور رویہ اسلام کی عملی شہادت کا ذریعہ بنے۔
- ❑ سماجی طاقت پیدا کرنا۔ انھیں تعلیمی، سماجی اور معاشی لحاظ سے اوپر اٹھنا ہے تاکہ ان کی کم

زوری دور ہو اور وہ اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں آسکیں۔

- انسانوں کی بے لوث خدمت اور ان کے دل جیتنا۔ انھیں انسانوں کی بے لوث خدمت کرنی ہے، اپنے اجتماعی رویہ سے اسلام کے نظام رحمت ہونے کی شہادت دینی ہے۔ عدل و قسط کا علم بردار بننا ہے۔ کم زوروں اور مجبوروں کا سہارا بننا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی شناخت انسانیت کے سچے خیر خواہ کی حیثیت سے قائم ہو جائے۔

ان امور کے سلسلے میں دلائل اور قرآن و حدیث کے تفصیلی حوالوں کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ یہ تقریباً متفق علیہ باتیں ہیں۔ تمام ہی مکاتب اور مسالک کے اہل علم کی تقریروں و تحریروں میں ان باتوں کی مسلسل تکرار ہوتی رہی ہے لیکن اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ یہ امور، مسلمانان ہند کے اصل نصب العین کی حیثیت آج تک بھی اختیار نہیں کر پائے ہیں۔ وعظوں اور تقریروں میں خیر امت اور دعوت دین کی مسلسل تکرار کے باوجود، یہ ہمارا ایسا اجتماعی نصب العین نہیں بن سکا، جس پر امت کے سواد اعظم کی نظریں یکسوئی کے ساتھ مرکوز ہو جائیں۔

آزادی کے بعد ہماری اجتماعی کوششیں زیادہ تر جان و مال کے تحفظ اور دشمنان اسلام کے مقابلے میں دفاع پر مرکوز رہیں۔ مسلم سیاست نے بھی انھی باتوں کو اپنا محور و مرکز بنایا جس کے نتیجہ میں مدافعانہ ذہن پروان چڑھنے لگا۔ مدافعت اور رد عمل پر مبنی ذہن کبھی تعمیر و ترقی کے طاقت ور محرکات فراہم نہیں کر سکتا۔ اس کے نتیجہ میں ہم ہمیشہ حال کی الجھنوں میں گرفتار ہو کر رہ جاتے ہیں اور مستقبل تک ہماری نظریں نہیں اٹھ پاتیں۔ راستے کی رکاوٹوں میں ایسے الجھ جاتے ہیں کہ منزل نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ ہم رد عمل کی نفسیات کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں اور کسی اقدامی اور ایجابی ایجنڈے پر صبر کے ساتھ طویل المیعاد جدوجہد ممکن نہیں رہ جاتی۔ ہمارا ایجنڈا، ہم خود نہیں بلکہ ہمارے دشمن سیٹ کرنے لگتے ہیں۔ ان کے نعروں کے مقابلے میں جوابی نعروں، ان کے پینتروں اور ہتھکنڈوں کے رد عمل میں دفاعی اقدمات اور ان کے بچھائے ہوئے جالوں سے خود کو بچانے اور محفوظ رکھنے کی کوششوں میں ہماری ساری اجتماعی توانائیاں صرف ہونے لگتی ہیں۔ مایوسی، خوف و ہراس، انفعالیت اور بے بسی اس دفاعی نفسیات کی لازمی خصوصیات ہیں۔ نگاہیں منزل پر نہ ہوں تو راستے کی ہر چھوٹی سے چھوٹی رکاوٹ، بڑا پہاڑ محسوس ہونے لگتی ہے اور اعصاب پر اس طرح

سوار ہو جاتی ہے کہ بس اُس کا ازالہ ہی زندگی کا نصب العین بن جاتا ہے۔ چنانچہ کبھی کوئی این آر سی کا شوشہ چھوڑتا ہے اور اونچے دانش وروں اور قائدین سے لے کر سوشل میڈیا پر مصروف طالب علم تک، ہر ایک کئی مہینوں کے لیے مصروف ہو جاتا ہے۔ کوئی لنچنگ کے واقعات پر ماتم و سینہ کوبی اور لعنت و ملامت کو ملت کی خدمت سمجھ بیٹھا ہے تو کسی کے نزدیک کوئی اور مسئلہ امت مسلمہ کا واحد ایجنڈا ہے۔ ہمارے ذمہ دار لوگوں کی تقریریں ہوں یا دانش وروں کی تحریریں، ہماری صحافت ہو یا سوشل میڈیا پر تحریروں کا سیلاب، ہر جگہ یہی منظر سامنے آتا ہے۔ کہیں بھی کسی لانگ ٹرم ہدف اور حتمی وژن کا ذکر نہیں ملتا۔ یہ الجھنیں اس بات کی علامت ہیں کہ اپنے اصل مقصد و نصب العین کے بارے میں امت کا تصور بہت دھندلا گیا ہے۔ اس تبصرہ سے مذکورہ مسائل کی اہمیت کا انکار مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہم انھیں وقتی مسائل کی جگہ ضرور دیں، ان کے حل کی ممکنہ تدابیر بھی اختیار کریں لیکن ایسی چھوٹی باتوں کو اپنی زندگی کی اصل دل چسپی اور اپنی توجہات کا اصل مرکز کسی مرحلہ میں بھی نہ بنائیں۔ یہ بات اس امت کے مقام و مرتبہ سے فروتر ہے کہ وہ صرف اپنی شہریت کے دفاع کی فکر میں دن رات صرف کرے یا لنچنگ کا خوف اس کے اعصاب پر سوار ہو جائے یا اس کے دانش وروں اور مفکرین کا کام بس یہ رہ جائے کہ وہ امت کی پسماندگی کا رونا روتے رہیں۔

ہم روزانہ سڑک کے حادثوں اور ان میں مرنے والوں کی خبریں پڑھتے رہتے ہیں۔ ہم جب سڑک پر گاڑی نکالتے ہیں تو حادثے کا اچھا خاصا امکان ہمیشہ رہتا ہے۔ لیکن گاڑی چلاتے ہوئے اگر حادثہ اور اس کا امکان ہمارے اعصاب پر سوار رہے تو شاید ہی ہم گاڑی چلا پائیں۔ سڑک پر چلنے کا فلسفہ یہی ہے کہ ہم حادثے سے بچنے کی ضروری تدابیر ضرور اختیار کریں، گاڑی بھی چوکس رہ کر چلائیں لیکن ہماری توجہات کا مرکز ہماری منزل رہے۔ جس طرح راستے کی معمولی رکاوٹوں میں الجھ جانا ہمیں منزل سے دور کر دیتا ہے، اسی طرح حادثات کا حقیقی و غیر حقیقی خوف اگر اعصاب پر سوار ہو جائے تو ہم ڈرائیونگ کے لائق نہیں رہتے۔

دانش وروں کی ایک جماعت تعلیمی و معاشی ترقی پر توجہات کو مرکوز کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ اول تو یہ بات بحث طلب ہے کہ کیا صرف تعلیمی و معاشی ترقی کسی قوم یا انسانی گروہ کا مقصد حیات بن سکتی ہے؟ جیسا کہ ہم نے اوپر واضح کیا ہے، معاشی و تعلیمی ترقی کے لیے بھی

محرک درکار ہوتا ہے۔ یہ محرک ایک بلند ملی نصب العین ہی فراہم کرسکتا ہے اور وہ نصب العین ایسا ہونا چاہیے جو اہل اسلام کے ایمان و اعتقاد سے ہم آہنگ ہو۔ ایک فرد اپنی اور اپنے خاندان کی خوش حالی کے لیے تعلیم حاصل کرتا ہے اور معاشی تگ و دو کرتا ہے۔ ایک قوم اور اجتماعی گروہ کے پاس جب تک کوئی اجتماعی مقصد اور ہدف نہ ہو وہ کس لیے ترقی کرے اور کیوں تعلیم میں آگے بڑھے؟

ملت اسلامیہ ہند کی یہ بڑی اہم ضرورت ہے کہ وہ اس ملک میں اپنی اور اپنے اجتماعی وجود کی معنویت کا شعور پیدا کرے۔ یہ یقین پیدا کرے کہ وہ ایک داعی امت ہے اور ایک ہدف اور مقصد کے ساتھ اسے جینا ہے۔ وہ دعوت دین اور مذکورہ چار نکات کو اپنا وژن بنائے اور اس کی لیے یکسو ہوجائے۔ ہمارے جہد و عمل کا محور، ہمارا یہ ہدف بن جائے۔ یہ ہوگا تو ان شاء اللہ، ہمارا قافلہ یکسوئی اور ہم آہنگی کے ساتھ اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ آگے بڑھے گا اور چھوٹے مسائل اور روزمرہ کی رکاوٹوں میں الجھ کر رد عمل کی نفسیات کا شکار نہیں ہوگا۔ و ما توفیقی الا باللہ۔

(زندگی نو، دسمبر ۲۰۱۹)

خود اعتمادی اور یقین

اس وقت ہندوستانی مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں اس میں اُن کو سب سے زیادہ اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ بس یہ ہے کہ ان کے اندر ایمان کی قوت پروان چڑھے اور اس کے ذریعے اُمید، خود اعتمادی، جہد و عمل اور اپنے زور بازو پر بھروسا اور حالات کو بدلنے کا عزم پیدا ہو۔ لیکن اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اصحابِ علم اور اصحابِ قلم کے ایک طبقے نے ڈر، خوف، خود ملامتی اور مایوسی و ناامیدی کی اشاعت کو اپنا مشن بنالیا ہے۔ حادثات و واقعات کی مبالغہ آمیز اور کبھی غلط و بے بنیاد ترجمانی، مستقبل کے تعلق سے انتہائی شدید قسم کے خوف اور اندیشوں کی ترویج، ہر معاملے میں اُمت پر لعنت و ملامت اور ساری دنیا کو اپنا دشمن باور کرانے کی کوشش اِس مکتبِ دانش وری کی چند نمایاں خصوصیات ہیں۔ سوشل میڈیا جیسے تیز رفتار اور غیر منضبط میڈیم نے ان خیالات اور ان کے اثرات کو آناً فاناً پھیلا دینا نہایت آسان بنادیا ہے۔ چند دنوں پہلے اچانک خبر اُڑی کہ حکومت نے پورے ملک میں این آر سی لانے کا اعلان کردیا ہے اور اسی فرد کی شہریت قبول کی جائے گی جو دستاویزات کے ذریعے اپنے یا اپنے اجداد کے ۱۹۵۱ء میں ہندوستانی شہری ہونے کا ثبوت پیش کرے۔ اس خبر نے خوف کی ایک سرد لہر ملک بھر میں دوڑادی۔ نیم دانش وروں کی ایک پوری فوج میدان میں اتر آئی۔ کسی کو پاپولیشن رجسٹر کا گزٹ نوٹیفکیشن ملا تو گویا اس دعوے کا دستاویزی ثبوت مل گیا۔ این آر سی آسام کے مطلوبہ دستاویزات کی فہرست کسی کے ہاتھ لگی تو کاپی پیسٹ کرکے اسے ملک بھر کے این آر سی کی مطلوبہ دستاویزات قرار دے دیا گیا۔ چند گھنٹوں میں یہ سب ادھوری، ناقص اور مسخ شدہ معلومات پورے ملک میں عام ہوگئیں۔ لنچنگ کے واقعات کی رپورٹنگ

اس طرح کی جانے لگی گویا اب ملک میں مسلمان کہیں محفوظ ہی نہیں ہیں۔ ایک صاحب نے لکھا کہ انھیں دلّی کی سڑک پر کار چلاتے ہوئے لنچنگ کا خوف ہوتا ہے۔ کسی نے ٹرین میں کوئی طعنہ دیا تو دوسرے دن سوشل میڈیا پر لکھ دیا گیا کہ میری لنچنگ کی کوشش ہوئی، بال بال بچ کر آیا ہوں۔ یہ بات کثرت سے کہی جانے لگی کہ اب ملک کی اکثریت مکمل طور پر فرقہ پرست اور اسلام دشمن بن چکی ہے۔ جو لوگ خود کو سیکولر باور کراتے ہیں وہ بھی اندر سے فرقہ پرست ہی ہیں۔ اب ملک میں مسلمانوں کا کوئی ہم درد نہیں بچا ہے۔ ان کے قائدین اور جماعتیں بھی ان کی ہم درد نہیں ہیں بلکہ وہ خود بھی اپنے ہم درد نہیں ہیں۔ ملک کے حالات پر احتجاج اور غم و غصہ کے اظہار کی یہ ایک شکل ہو سکتی ہے لیکن ان کی اشاعت چوں کہ اردو اخباروں میں یا مسلمانوں کے سوشل میڈیا نیٹ ورکوں میں ہی ہوتی ہے اس لیے ان کا نتیجہ سوائے خوف اور مایوسی فروغ پانے کے، اور کچھ نہیں نکلتا۔

سوال یہ ہے کہ اس طرح کا خوف اور مایوسی پھیلا کر ہم کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ اور یہ کس مسئلے کا حل ہے؟ جو طاقتیں اسلام اور مسلمانوں کی دشمن ہیں، اُن کا اصل ہدف یہی ہے کہ مسلمان مایوس اور ناامید ہو جائیں۔ کسی قوم کے لیے سب سے بڑی تباہی مایوسی و ناامیدی ہے۔ سخت حالات کی عمر مختصر ہوتی ہے لیکن اگر پست ہمتی اور خوف کی نفسیات عام ہو جائے تو اس کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ یہ نفسیات زندگی کی امنگ چھین لیتی ہے۔ خود اعتمادی کو مجروح کرتی ہے۔ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے حوصلوں کو ختم کرتی ہے۔ خوف اور ناامیدی عام ہو جائے تو سیاسی و سماجی جدوجہد تو دور کی بات ہے، معاشی و تعلیمی ترقی کے محرکات بھی کم زور ہو جاتے ہیں۔ افراد کی طرح اجتماعی گروہوں کے لیے بھی امید اور اعتماد ایک بڑی اہم طاقت اور قوت محرکہ ہوتی ہے۔ اگر امید کی لو روشن رہے تو بڑی سے بڑی ناکامی اور بھیانک سے بھیانک سانحہ بھی قوموں کی کمر نہیں توڑ سکتا۔ وہ اپنی خاکستر میں بھی امید کی چنگاریوں کو بچائے رکھتے ہیں اور مناسب وقت پر مثبت تبدیلی کا ایک ہلکا سا جھونکا ان چنگاریوں کو بھڑکا کر شعلہ بنا دیتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر امید و یقین کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے تو سائے اور واہمے بھی دہشت طاری کرنے لگتے ہیں۔ ہوا کے جھونکے سے بھی

تباہ کن آندھی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ایسی قوموں کو مارنے کے لیے کسی دشمن کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اندیشوں اور واہموں کی شکار ہو کر وہ اپنی موت آپ مر جاتی ہیں۔

اسلامی عقائد اور سخت حالات

اسلام اور اسلامی عقیدہ، مایوسی اور خوف کی نفسیات کا سخت دشمن ہے۔ اللہ پر ایمان اور اس کی صفات کا استحضار، اہل ایمان کو ہرگز مایوس اور ناامید ہونے نہیں دیتا۔

> وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللهِ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔ سورہ یوسف، آیت ۸۷)۔

مایوسی اور ناامیدی اللہ تعالیٰ کو کس قدر ناپسند ہے، اس کا اندازہ قرآن مجید کی اس آیت سے ہوتا ہے۔

> مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ (جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ خدا دنیا اور آخرت میں اس کی مدد نہیں کرے گا تو اسے چاہیے کہ ایک رسی کے ذریعے آسمان تک پہنچ کر شگاف لگائے۔ پھر دیکھے کہ آیا اس کی یہ تدبیر اس چیز کو دور کر سکتی ہے جو اسے غصہ میں لا رہی تھی۔ سورہ حج، آیت ۱۵)

اس آیت کی تشریح میں مولانا ابوالکلام آزادؒ لکھتے ہیں (اگر چہ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ کا جو مطلب مولانا آزادؒ نے لیا ہے وہ ہمارے منتخب کردہ ترجمے سے مختلف ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی یہ تشریح قابل توجہ ہے):

> جس انسان نے امید و یقین کی جگہ شک و مایوسی کی راہ اختیار کی، خواہ دنیا کی زندگی کے لیے ہو خواہ آخرت کے لیے، اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اب اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ ایسے آدمی کے لیے صرف یہی چارہ رہ جاتا ہے کہ گلے میں پھندا ڈالے اور زندگی ختم کر ڈالے! سبحان اللہ، انسانی زندگی کے تمام مسائل اس ایک آیت نے حل کر دیے۔ زندگی امید اور سعی ہے۔ موت مایوسی اور ترک سعی ہے۔ پس اگر ایک بدبخت نے فیصلہ کر لیا کہ

خدا کے پاس اس کے لیے کچھ نہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، تو پھر اس کے لیے باقی کیا رہا؟ کیا ہے جس کے سہارے وہ زندہ رہ سکتا ہے؟ اور وہ زندہ رہے تو کیوں رہے؟

لیکن نہیں، ایمان نام ہی امید کا ہے۔ اور مومن وہ ہے جو مایوسی سے کبھی آشنا نہیں ہوسکتا۔ اس کا ذہنی مزاج کسی سے بھی اتنا بیگانہ نہیں جس قدر مایوسی سے۔ زندگی کی مشکلیں اسے کتنا ہی ناکام کریں لیکن وہ پھر سعی کرے گا۔ لغزشوں اور گناہوں کا ہجوم اسے کتنا ہی گھیر لے لیکن وہ پھر توبہ کرے گا۔ نہ تو دنیا کی کامیابی سے وہ مایوس ہوسکتا ہے نہ آخرت کی نجات سے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا کی مایوسی موت ہے اور آخرت کی مایوسی شقاوت۔ وہ دونوں جگہ رحمت الٰہی کو دیکھتا اور اس کی بخششوں پر یقین رکھتا ہے۔[1]

قرآن مجید نے متعدد مقامات پر یہ وضاحت کی ہے کہ اہل ایمان پر آنے والی آزمائشیں بھی بے مقصد نہیں ہوتیں۔ ان کے اپنے مقاصد ہوتے ہیں۔ اہل ایمان کو پیش آنے والی مشکلات و مصائب بھی ربِّ کائنات کی مشیت کا حصہ ہیں۔ اللہ کی مرضی اور اس کی مشیت کے بغیر دنیا کی کوئی طاقت ہمارا بال بھی بیکا نہیں کرسکتی۔

وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ

(اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے، اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ سورہ یونس، آیت ۱۰۷)

قرآن کے مطابق مشکلات و مصائب کے چار ممکنہ اسباب ہوسکتے ہیں:

۱۔ مشکلات و مصائب ہمارے گناہوں کا خمیازہ ہوسکتے ہیں۔ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ وَیَعْفُوْ عَنْ كَثِیْرٍ (تم پر جو مصیبت بھی آئی ہے، تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے، اور بہت سے قصوروں سے وہ ویسے ہی درگزر کر جاتا ہے۔ سورہ شوریٰ، آیت ۳۰)

۲۔ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تنبیہ اور وارننگ ہوسکتے ہیں۔

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ۔ (کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک دو مرتبہ یہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں؟ مگر اِس پر بھی نہ توبہ کرتے ہیں نہ کوئی سبق لیتے ہیں۔ سورہ توبہ، آیت ۱۲۵)

وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (اور ہم ان کو اچھے اور بُرے حالات سے آزمائش میں مبتلا کرتے رہے کہ شاید یہ پلٹ آئیں۔ سورہ اعراف، آیت ۱۶۸)

۳۔ مشکلات و مصائب کا ایک اہم سبب اہل اسلام کی آزمائش اور ان کا امتحان ہوتا ہے۔

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ (یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں، اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی راستی کے گواہ ہوں۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۴۰)

۴۔ چوتھا سبب یہ کہ مشکلات اور مصائب اللہ کی کسی بڑی اسکیم اور کسی بڑے خیر کا ذریعہ بھی ہو سکتے ہیں۔

وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْــًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْــًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۱۶)

اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (واقعہ یہ ہے کہ میرا ربّ غیر محسوس تدبیروں سے اپنی مشیّت پوری کرتا ہے، بے شک وہ علیم اور حکیم ہے۔ سورہ یوسف، آیت ۱۰۰)

اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے لیے ایک اندھے کنویں کی وحشت ناک تنہائی کو مصر کے تاج و تخت کا پہلا زینہ اور زندانِ مصر کی طویل قید کو دوسرا زینہ بنا دیا۔ اسی طرح خدائے علیم و حکیم نے تاریخ میں متعدد مرتبہ سخت آزمائشوں کو قوموں کے لیے کسی بڑی کام یابی کا ذریعہ

بنایا ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ سخت اور مشکل حالات سے تو اللہ کے برگزیدہ ترین بندوں یعنی انبیا علیہم السلام کو گزرنا پڑا۔

عَنْ سَعْدِ بنِ أَبِي وقاص رضي الله عنه قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، أَيُّ النَّاسِ أَشَدُّ بَلاءً؟ قَالَ: الأَنْبِيَاءُ، ثُمَّ الأَمْثَلُ فَالأَمْثَلُ، فَيُبْتَلَى الرَّجُلُ عَلَى حَسَبِ دِينِهِ، فَإِنْ كَانَ دِينُهُ صُلْبًا اشْتَدَّ بَلاؤُهُ، وَإِنْ كَانَ فِي دِينِهِ رِقَّةٌ ابْتُلِيَ عَلَى حَسَبِ دِينِهِ، فَمَا يَبْرَحُ الْبَلاءُ بِالْعَبْدِ حَتَّى يَتْرُكَهُ يَمْشِي عَلَى الأَرْضِ مَا عَلَيْهِ خَطِيئَةٌ

سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! سب سے زیادہ مصیبت کس پر آتی ہے؟ آپ نے فرمایا: "انبیاورسل پر، پھر جو اُن کے بعد مرتبہ میں ہیں، پھر جو اُن کے بعد ہیں، بندے کی آزمائش اس کے دین کے مطابق ہوتی ہے، اگر بندہ اپنے دین میں سخت ہے تو اس کی مصیبت بھی سخت ہوتی ہے اور اگر وہ اپنے دین میں نرم ہوتا ہے تو اس کے دین کے مطابق مصیبت بھی ہوتی ہے، پھر مصیبت بندے کے ساتھ ہمیشہ رہتی ہے، یہاں تک کہ بندہ روے زمین پر اس حال میں چلتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔[۲]

چنانچہ سخت حالات سے اہل ایمان نہ گھبراتے ہیں اور نہ مایوسی و پست ہمتی کا شکار ہوتے ہیں بلکہ مذکورہ چاروں مقاصد کو سامنے رکھ کر وہ اپنے رد عمل کا تعین کرتے ہیں۔ اپنی غلطیوں اور کم زوریوں کا بے لاگ جائزہ لیتے ہیں اور خدا کے حضور توبہ و استغفار کرتے ہیں۔ اللہ کی وارننگ کو محسوس کرتے ہیں اور اپنی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ استقامت کے ساتھ اپنے اصولوں پر جمے رہتے ہیں اور اس امتحان میں کام یاب ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالات کو بہتر بنانے کی ممکنہ تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ اللہ سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اس دوران جو مشکلات درپیش ہوں ان کا پامردی اور خوش دلی کے ساتھ سامنا کرتے ہیں اور اپنا فوکس اپنے اصل مقصد و نصب العین پر بنائے رکھتے ہیں۔

موجودہ حالات اور ان کا تناظر

ہمارے ملک کے موجودہ حالات یقینا بعض پہلوؤں سے تشویش ناک ہیں۔ لیکن ان

حالات کو اُن کے صحیح تناظر میں دیکھنا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ اِن حالات کے حقیقی اسباب و محرکات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور اُن سے نبرد آزما ہونے کی مناسب حکمتِ عملی اختیار کی جائے۔ حالات و واقعات کی انتہا پسندانہ اور غیر حقیقی تعبیرات اور اُن کو بنیاد بنا کر خود کو مستقل موہوم اندیشوں میں گرفتار کر لینا اور پوری امت میں خوف و ہراس اور نا امیدی کا ماحول پیدا کرنے کا سبب بننا کسی صورت جائز نہیں ہو سکتا۔

حالات کا سب سے تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے تئیں منفی جذبات تیزی سے فروغ پا رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ملک کے تمام عوام فرقہ پرست ہو چکے ہیں۔ یہ بات نہ صرف غیر حقیقی ہے بلکہ اُن کروڑوں انصاف پسند لوگوں کی سخت توہین ہے جو فرقہ پرست قوتوں کے خلاف مسلمانوں سے کہیں زیادہ جرأت و حوصلہ کے ساتھ برسرپیکار ہیں۔ آج بھی ملک کے ہر حصے میں مسلمان غیر مسلموں کے درمیان رہ رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ ملازمتیں کر رہے ہیں، کاروبار کر رہے ہیں، ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہیں، سفر میں، دفتروں میں، محلوں اور آبادیوں میں، ہر جگہ، ایک دوسرے کے لیے ایثار و قربانی اور دوستی و انسان نوازی کے دل نواز مناظر کم نہیں ہوئے ہیں۔ اس معاملہ میں ملک کی مختلف ریاستوں کی صورت حال مختلف ہے، لیکن ہمارا مشاہدہ یہی ہے کہ ملک میں کہیں بھی ایسی صورت حال نہیں ہے کہ یہ کہا جائے کہ پورا سماج زینوفوبک (xenophobic) یا فرقہ پرست ہو چکا ہے۔

لیکن یہ بات صحیح ہے کہ فرقہ پرستی کی فضا دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ فرقوں کے درمیان کبھی کبھار شکایتوں کا پیدا ہو جانا یا جھڑپوں کا ہونا، ہمارے ملک میں نئی بات نہیں ہے لیکن مستقل نفرت و عناد کی فضا یقیناً ملک کے اکثر حصوں کے لیے ایک نامانوس صورت حال ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ صورت حال بڑھ رہی ہے۔ خصوصاً نئی نسل میں اور نوجوانوں میں، حالات و واقعات کو خالص فرقہ پرست زاویے سے دیکھنے کا رجحان تیزی سے عام ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک میں اس سے پہلے کبھی حلال غذا پر اعتراض نہیں ہوتا تھا، لیکن اب ہونے لگا ہے۔ ملک کے تمام ہی عوام حجاب کی عام طور پر

عزت کرتے تھے لیکن اب اس پر پابندی کے مطالبات اٹھنا شروع ہوئے ہیں۔ تشدد کے واقعات جو صرف فرقہ وارانہ تناؤ کے حالات میں پیش آتے تھے، اب عام حالات میں بھی پیش آنے لگے ہیں۔ حالات کی یہ تبدیلی فوری توجہ اور اصلاحِ حال کی تیز رفتار کوششوں کا ضرور تقاضا کرتی ہے لیکن ان حالات سے ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ حالات بدلے جاسکتے ہیں بشرطے کہ صحیح سمت میں کوشش کے لیے ہم تیار ہوں۔

حالات کا دوسرا تشویش ناک پہلو ملک کے نظام حکم رانی پر استبدادی اور فسطائی رجحانات کا غلبہ ہے۔ جمہوری اداروں اور روایات کی بری طرح پامالی، عوام کے انسانی حقوق سے بے پروائی، قوانین کا استحصال اور ہر مخالف آواز کو دھن، دھونس اور دھاندلی کے ذریعے دبانے کی کوشش، ان رجحانات کی وہ نمایاں خصوصیات ہیں جو گذشتہ چندماہ کے متعدد واقعات سے بہت واضح ہوکر سامنے آئی ہیں۔ ملت اسلامیہ اور ان کے شعائر کے سلسلہ میں مستقل توہین و بے اعتنائی کے جس رویے کا مظاہرہ کیا جارہاہے، اُس کا مقصد یہی ہے کہ مسلمان احساس کمتری، خوف، اشتعال اور بوکھلاہٹ کی نفسیات کے شکار ہوجائیں۔ اندیشہ یہ ہے کہ ایسے اقدامات کی شدت آئندہ اور زیادہ بڑھے گی۔ لیکن نظام حکم رانی کے بگاڑ کا یہ مسئلہ اصلاً پہلے مسئلے ہی کا، یعنی سماجی سطح پر فرقہ پرستی کے فروغ ہی کا نتیجہ ہے۔ فرقہ پرست طاقتوں کے سیاسی غلبے کا ایک اہم سبب در اصل سماج میں فرقہ پرستی میں اضافہ ہے۔

اس صورت حال کے متعدد اسباب ہیں۔ نسل پرستی کا فروغ اس وقت ایک عالمی مسئلہ ہے۔ مختلف وجوہ سے ساری دنیامیں نسل پرست اور فرقہ پرست طاقتوں کو تیزی سے فروغ حاصل ہورہا ہے۔ خاص طور پر اسلام کے تئیں خوف (اسلاموفوبیا) پوری دنیامیں پھیل رہاہے۔ اس کی ایک اہم وجہ خود اسلام کا ایک نظریاتی طاقت کے طور پر ابھرنا ہے۔ ہمارے ملک میں کانگریس اور سوشلسٹ سیاسی قوتوں کا زوال بھی اس کا ایک اہم سبب ہے۔ ان سیاسی تحریکوں کی نظریاتی اساس وقت کے ساتھ کم زور ہوتی چلی گئی۔ کرپشن اور خاندانی و مفاد پرستانہ سیاست کے مکمل غلبہ کی وجہ سے

وہ سماجی سطح پر ایک موثر نظریاتی قوت کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہیں۔ بڑے سرمایہ داروں نے بھی ان سیکولر قوتوں کو ایک بوجھ سمجھنا شروع کیا اور اپنا وزن دھیرے دھیرے مکمل طور پر دائیں بازو کی قوتوں کے پلڑے میں ڈال دیا۔ سرمایہ داری کے عالمی غلبے کے اس زمانے میں، یہ بھی ایک بہت بڑا ڈیولپمنٹ تھا۔ ان حالات میں یہاں برسوں۔سے نہایت منظم طریقے سے کام کرنے والی فرقہ پرست سیاسی وسماجی تحریکوں کو سنہری موقع حاصل ہوگیا اور انھوں نے بہت چابک دستی اور مہارت کے ساتھ اسے استعمال کیا۔

لیکن ان سب کے باوجود، واقعہ یہ ہے کہ آج بھی اس ملک میں فسطائی اور فرقہ پرست رجحانات کی سماجی بنیادیں مضبوط اور مستحکم نہیں ہیں۔ حالات کی تبدیلی اور متبادل نظریاتی وسماجی رجحانات کا ظہور انھیں تیزی سے کم زور کرسکتا ہے۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ سخت گیر رائے عامہ اور ظلم وستم کی عمر ہمیشہ کم ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کے مخصوص حالات میں تو اس کا امکان اور زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ ایسے رجحانات زیادہ دیرپا نہ رہیں۔ دیر سویر، ان کے نقصانات نمایاں ہوں گے اور ملک کی رائے عامہ ان کے خلاف بے دار ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ تبدیلی محض ہاتھ پر ہاتھ دھرے انتظار کرنے سے نہیں آئے گی۔ اس کے لیے تدبیر اور کوشش کرنی ہوگی۔ لیکن ان سب تدابیر کو اختیار کرنے اور درست سمت میں جدوجہد کرتے رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ہماری اجتماعی نفسیاتی صحت درست رہے۔ اور ہمارا رویہ وہی ہو جو اسلامی عقائد اور قرآن کی تعلیمات پیدا کرنا چاہتی ہیں۔

اجتماعی نفسیاتی صحت

قرآن مجید نے اہل اسلام کی کام یابی کے لیے جن صفات کو ضروری قرار دیا ہے، اُن میں ایمان اور عمل صالح کے علاوہ صبر، توکل اور توبہ کی صفات نمایاں ہیں۔ صبر، توکل اور توبہ اہل ایمان کی نفسیاتی صحت کے تین اہم عنوانات ہیں۔ موجودہ حالات میں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم حالات سے مایوس ہوئے بغیر اپنے اصولوں پر استقامت کے ساتھ جمے رہیں۔ اپنا اصل کام، یعنی

دعوت دین کا کام کرتے رہیں اور اسی پر اپنی توجہات کو مرکوز رکھیں اور ہمارا اجتماعی مزاج صبر، توکل اور توبہ کی صفات سے عبارت ہو۔

صبر

صبر کو قرآن مجید نے کام یابی و سربلندی کی ایک اہم شرط قرار دیا ہے۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ کَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا وَدَمَّرْنَا مَا کَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا کَانُوْا یَعْرِشُوْنَ

(ان کی جگہ ہم نے ان لوگوں کو جو کم زور بنا کر رکھے گئے تھے، اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدہ خیر پورا ہوا کیوں کہ انھوں نے صبر سے کام لیا تھا اور فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ برباد کر دیا گیا جو وہ بناتے اور چڑھاتے تھے۔ سورہ اعراف، آیت ۱۳۷)

صبر کیا ہے؟ صبر بزدلی کا نام نہیں ہے اور نہ یک طرفہ طور پر کش مکش و مقابلہ سے دست برداری صبر ہے۔ خوف، ناامیدی، مایوسی، اشتعال، غصہ و غضب، شہوت، عیش و عشرت اور جاہ طلبی وغیرہ جیسے منفی جذبات کے مقابلے میں اپنی قدروں، اصولوں اور اپنے اصل مقصد پر استقامت کے ساتھ ڈٹے رہنے کا نام صبر ہے۔ صبر اپنے آپ پر مکمل کنٹرول کا نام ہے اور اس بات کا نام ہے کہ کوئی قدم بھی، شعوری فیصلے کے بغیر نہ اٹھے۔ اگر کسی گروہ کو آسانی سے مشتعل کیا جاسکے اور وہ اشتعال میں آکر بغیر سوچے سمجھے کوئی قدم اٹھا بیٹھے تو یہ اجتماعی بے صبری ہے۔ اسی طرح کوئی قوم آسانی سے ڈر اور خوف کے جذبات کی شکار ہو جائے اور جن اقدامات کو وہ شعوری طور پر مناسب اور ضروری سمجھتی ہے انھیں ڈر کی وجہ سے نہ کر سکے تو یہ بھی بے صبری ہے۔ بے صبری شعور پر منفی جذبات کے غلبے کا نام ہے۔ اشتعال بھی ایک منفی جذبہ ہے۔ جذباتیت بھی ایک منفی جذبہ ہے۔ ڈر اور مداہنت بھی ایک منفی جذبہ ہے۔ ان جذبات کو شعور کے ذریعے قابو میں رکھنے کا نام ہی صبر ہے۔ یہ صفت اگر اجتماعی طور پر پوری قوم میں پیدا ہو جائے تو اک بڑی طاقت بن جاتی ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم کو مشتعل (provoke) کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، ان کوششوں کو بھی صبر و استقامت کے ساتھ ناکام بنا دینے کی صلاحیت ہمارے اندر پیدا ہو اور ہمیں مایوس، پست ہمت اور خوف و ہراس کا شکار بنا دینے کی جو تدبیریں اختیار کی جارہی ہیں ان کا مقابلہ کرنے کی بھی ہمارے اندر صلاحیت پیدا ہو۔

توکل

اسی طرح، قرآن مجید نے اللہ کی مدد و نصرت کو جن باتوں کے ساتھ مشروط رکھا ہے ان میں ایک اہم توکل کی صفت ہے۔

> وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ
>
> (جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اُس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اُس کا گمان بھی نہ جاتا ہو جو اللہ پر بھروسا کرے اس کے لیے وہ کافی ہے۔ سورہ طلاق، آیت ۲ اور ۳)

توکل کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے مقصد کے لیے ساری ممکنہ تدبیریں اختیار کرے اور اس کے بعد اللہ پر بھروسا کرے۔ تدبیر سے گریز توکل نہیں ہے جیسا کہ مشہور حدیث میں ہم کو وضاحت ملتی ہے۔ سمعت انس بن مالک يقول : قال رجل: يا رسول الله أَعْقِلُهَا وَأَتَوَكَّلُ أَوْ أُطْلِقُهَا وَأَتَوَكَّلُ؟ قَالَ اعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ (یعنی ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور اونٹ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! کیا میں اسے باندھ کر توکل کروں یا اسے چھوڑ دوں اور توکل کروں۔ آپ نے فرمایا، باندھو اور توکل کرو۔[۳]) یعنی تدبیر کا حق ادا کرو اور پھر توکل کرو۔ اسی طرح ممکنہ تدابیر اختیار کرنے کے باوجود خوف اور اندیشوں کی نفسیات کا شکار ہو جانا، یہ بھی توکّل کے خلاف ہے۔ توکل یہ ہے کہ جو کچھ ممکن ہے اسے کر گزرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے اور جو بات ہمارے دائرہ اختیار سے پرے ہے، اسے اللہ پر چھوڑ دیا جائے اور اُس سے اچھی امید رکھی

جائے۔ توکل افراد اور قوموں کو ممکنات پر ارتکاز (focus on possibilities) عطا کرتا ہے۔ جو باتیں ہمارے دائرۂ امکان سے پرے ہیں، ان کے سلسلے میں خوف اور اندیشے کا شکار ہو جانا، اس کا رونا رونے میں وقت ضائع کرنا اور اپنے قویٰ کو موہوم اندیشوں کا شکار ہو کر ناکارہ کر دینا، یہ کم زور اور ناکام افراد اور قوموں کی صفت ہوتی ہے۔ جب کہ کام یاب افراد کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان کی نظر اپنے مقصود پر ٹکی ہوتی ہے۔ جو کچھ ان کے بس میں ہے اور ممکن ہے، اسے کر گزرنے پر ان کی زیادہ توجہ ہوتی ہے۔ جو امور ان کے دائرۂ امکان سے پرے ہیں، ان پر وہ زیادہ دھیان نہیں دیتے۔ توکل یہی اسپرٹ پیدا کرتا ہے۔ یہ سوچ کا ایک بالکل مختلف پیراڈائم ہے۔ یہ پیراڈائم افراد اور گروہوں کو عملیت پسند اور رجائیت پسند بناتا ہے۔ آج اسی عملیت پسندی کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے ذہنی اور عملی قویٰ، ان کاموں پر مرکوز ہو جائیں جو ممکن ہیں اور جن سے مثبت تبدیلی کا امکان ہے تو آج بھی بڑی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔

توبہ

قرآن مجید نے توبہ کو بھی کام یابی کی لازمی شرط قرار دیا ہے۔

> وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ (اور اے میری قوم کے لوگو، اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو، وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ سورہ ہود، آیت ۵۲)

اجتماعی زندگی میں توبہ دراصل خود کو بدلنے کی صلاحیت (changeability) کا نام ہے۔ کام یابی کے لیے جن اجتماعی اوصاف کی ضرورت ہے، ان میں ایک اہم صفت یہ ہے کہ ہم مستقل احتساب کی طرف مائل ہوں۔ اور جوں ہی اپنی کسی کم زوری کا احساس ہو، خود کو بدلنا ہمارے لیے دشوار نہ ہو۔ زوال اور کم زوری قوموں کو جمود کا شکار بنا دیتی ہے۔ ان کے اندر تبدیلی کے خلاف شدید مزاحمت (change resistance) پیدا ہو جاتی ہے۔ کم زوریوں کا احساس بھی ہو

اور مطلوب تبدیلی کا شعور بھی ہو تب بھی پوری قوم کا عملاً بدلنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسٹیٹس کو(status quo) کا یہ مزاج بہت بڑی کم زوری ہوتا ہے۔ اس سے کوئی بھی قوم زمانے کے تقاضوں کو نبھانے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید میں اہل ایمان کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کرنے والے اور توبہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور توبہ نہ کرنے والوں کو ظالم قرار دیا گیا ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (جو لوگ توبہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔ سورہ حجرات، آیت ۱۱) توبہ کے لفظی معنی ہی پلٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ فرد اور قوموں کو اگر اس بات پر قدرت حاصل ہو کہ وہ تیزی سے خود کو بدل سکیں، اسٹیٹس کو کو توڑ سکیں، جن تبدیلیوں کو شعوری طور پر وہ درست اور مطلوب سمجھتے ہیں، انھیں تیزی سے اختیار کر سکیں، تو یہ ان کے لیے بہت بڑی قوت ہوتی ہے۔

اس وقت شدید ضرورت ہے کہ اپنے اندر جن تبدیلیوں کو ہم ضروری سمجھتے ہیں، ان کو عملاً لانے کے لیے ہمارا سماج، ہمارے ادارے، ہماری قیادتیں، ہماری جماعتیں اور تنظیمیں اور افراد سب تیار ہوں۔ تبدیلی کا یہ عمل تیز رفتار ہو تاکہ ہم جلد سے جلد حالات کو بہتر بنانے کی صلاحیت سے آراستہ ہو سکیں۔

جو یقیں کی راہ پہ چل پڑے، انھیں منزلوں نے پناہ دی
جنھیں وسوسوں نے ڈرا دیا، وہ قدم قدم پہ بہک گئے

(زندگی نو، اکتوبر ۲۰۱۹)

حواشی و حوالہ جات

۱۔ ترجمان القرآن، ابوالکلام آزاد، اسلامی اکیڈمی، لاہور، ص ۷۸۵

۲۔ رواہ الترمذی، کتاب الزہد، باب ما جاء فی الصبر علی البلاء، صححہ الألبانی فی السلسلة الصحیحة

۳۔ سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع، رواہ انس بن مالکؓ، حسنہ الالبانی وغیرہ

صبر
امت کے لائحہ عمل کا اہم عنوان

قرآن مجید نے جن صفات کو قوموں کے عروج وترقی کا ایک اہم ذریعہ قرار دیا ہے ان میں ایک نمایاں صفت صبر کی صفت ہے۔ بدقسمتی سے صبر کا مفہوم یک طرفہ طور پر مزاحمت وکش مکش سے دست برداری سمجھ لیا گیا ہے۔ اس وجہ سے بعض لوگ اسے بزدلی کا رویہ سمجھتے ہیں۔ ذیل کی سطروں میں ہم قوموں کے لیے صبر کی اہمیت بھی واضح کریں گے، اس کے صحیح مفہوم پر بھی روشنی ڈالیں گے اور یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ امت کی حکمتِ عملی اور اس کے رویوں کی تشکیل میں صبر کا کیا رول ہونا چاہیے، نیز یہ کہ ہمارے موجودہ رویّوں میں کیا باتیں صبر کی اسپرٹ کے خلاف ہیں؟

قوموں کی زندگی میں صبر کی اہمیت

قرآن مجید میں صبر کو مومنوں کی اہم ترین صفات میں سے ایک صفت قرار دیا گیا ہے۔ آخرت میں کام یابی کے لیے جن صفات کی ضرورت ہے ان میں صبر کی صفت نمایاں ہے۔ سورہ عصر کو قرآن کی جامع ترین مختصر سورت کہا گیا ہے، اس میں دائمی خسارے سے حفاظت کو جن چار صفات پر منحصر قرار دیا گیا ہے ان میں ایک اہم صفت صبر اور تلقینِ صبر ہے۔ قرآن مجید میں متعدد جگہوں پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ صبر کی صفت آخرت کے ساتھ دنیا میں بھی کام یابی کے لیے ضروری ہے۔ ظالم وجابر قوتوں کے مقابلے میں حق پرستوں کا ایک چھوٹا سا گروہ کیسے عروج حاصل

کر سکتا ہے، اس کا نمونہ قرآن نے بنی اسرائیل کے واقعہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس عروج کے لیے بنی اسرائیل کی کیا صفت سبب بنی اس پر روشنی ڈالتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ:

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ

(اور اُن کی جگہ ہم نے اُن لوگوں کو جو کم زور بنا کر رکھے گئے تھے، اُس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدہ خیر پورا ہوا کیوں کہ انھوں نے صبر سے کام لیا تھا اور فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ برباد کر دیا گیا جو وہ بناتے اور چڑھاتے تھے۔ سورہ اعراف، آیت ۱۳۷)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں سیادت و قیادت صبر کی صفت کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ مخالفین کے ساتھ شدید کش مکش کے پس منظر میں اہل ایمان کو ہدایت دی گئی کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلہ میں پامردی دکھاؤ، حق کی خدمت کے لیے کمربستہ رہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ سورہ آل عمران، آیت ۲۰۰)

اگر کوئی طاقت ور حریف طرح طرح کی سازشیں کر رہا ہے تو کہا گیا کہ ان سازشوں کا مقابلہ صرف صبر کے ذریعے ممکن ہے۔ اگر تم صبر کرو تو دشمن کی بڑی سے بڑی سازش کو ناکام بنا سکتے ہو۔ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا (ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو)۔ سیدنا یوسف علیہ السلام آزمائشوں اور مشکلات کے طویل سلسلے کے بعد مصر کے تخت پر متمکن ہوئے تو انھوں نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ ان پر اس انعام و اکرام کی ایک وجہ صبر ہے۔ إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی تقویٰ اور صبر سے کام لے تو اللہ کے ہاں ایسے نیک لوگوں کا اجر مارا نہیں جاتا۔ سورہ

یوسف، آیت ۹۰) کام یابی و سربلندی کے لیے قوموں کی ایک بڑی ضرورت اچھی اور موثر قیادت ہے۔ کہا گیا کہ ایسی قیادت کی فراہمی بھی صبر کی صفت کے ساتھ مشروط ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا (اور جب کہ انھوں نے صبر کیا تو ہم نے ان میں پیشوا اٹھائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہ نمائی کرتے تھے۔ سورہ سجدہ، آیت ۲۴) اللہ تعالیٰ سے مدد و نصرت کے حصول کے لیے ایک طرف نماز کی تاکید کی گئی ہے جو اللہ سے تقرب کا ذریعہ ہے تو دوسری طرف صبر کا حکم دیا گیا ہے جو اپنے رویہ کی اصلاح ہے۔ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ (صبر اور نماز سے مدد لو۔ سورہ بقرہ، آیت ۴۵) دیگر اولوالعزم انبیا کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی قرآن نے ان کی ایک اہم صفت صبر قرار دی ہے۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (پس اے نبی، صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے۔ سورہ احقاف، آیت ۳۵) اور یہ کہ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِينَ (اور یہی نعمت اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل کو دی کہ یہ سب صابر لوگ تھے۔ سورہ انبیاء، آیت ۸۵)

صبر قرآن کا نہایت اہم موضوع ہے اور تقریباً نوے مقامات پر صبر کی فضیلت اور اس کے فوائد کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں ہم نے صرف اُن حوالوں پر اکتفا کیا ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی حکمتِ عملی کے سوال سے راست متعلق ہیں۔

صبر کیا ہے؟

صبر اُن اسلامی اصطلاحات میں سے ایک ہے جن کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ مصیبتوں اور آفات کے موقع پر اللہ کی ناشکری اور گلہ و شکایت سے بچنے اور اس کی مرضی پر راضی رہنے کا درست مفہوم تو عام طور پر یقیناً رائج ہے لیکن اس کے علاوہ صبر کو مقابلہ و کش مکش سے گریز، ظلم و زیادتی کے مقابلے میں یک طرفہ خاموشی، ہاتھ پر ہاتھ دھرے ظلم کے خاتمے کا خاموشی سے انتظار جیسے معنوں تک محدود سمجھا جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں زیادہ بڑے مصالح کے پیش نظر یہ باتیں بھی صبر کا تقاضا ہو سکتی ہیں لیکن صبر کو ان معنوں تک محدود کرنا اور ہمیشہ ان معنوں میں صبر کی تلقین

کرنا یقیناً اس عظیم قرآنی اصطلاح کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس مفہوم تک محدود رہنے سے اسلام کے نہ صرف متعدد احکام بے اثر ہوجاتے ہیں، بلکہ اسلام کی روح ہی متاثر ہوجاتی ہے۔

ہماری نظر میں صبر کی سب سے خوب صورت اور جامع تعریف وہ ہے جو امام راغب اصفہانیؒ نے کی ہے، وہ کہتے ہیں: حبس النفس علی مایقتضیه العقل والشرع، أو عما یقتضیان حبسها عنه (نفس کو کسی ایسے کام پر جمادینا جو شریعت اور عقل کی نظر میں اچھا ہو، یا اُس کام سے روک دینا جو شریعت اور عقل کی نظر میں بُرا ہو)[۱]

امام غزالیؒ نے بھی اس سے ملتی جلتی بات کہی ہے کہ صبر یہ ہے کہ آدمی "علم وعقل و دین کے داعیہ کو" اپنی ذات میں خواہش وشہوت کے داعیہ" پر فتح دلائے۔[۲] ان تعریفات کی رو سے صبر کا نہایت جامع مفہوم متعین ہوتا ہے۔ صبر اپنی شہوات اور جذبات پر قابو رکھنے کی صلاحیت کا نام ہے۔

افراد اور قومیں غلط راستوں کا انتخاب اکثر جذبات سے بے قابو ہوکر کرتی ہیں۔ جذبات پر عقل اور دین کے کنٹرول کا نام صبر ہے اور جذبات کا بے قابو ہوجانا جذباتیت یا بے صبری ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی کا ہر عمل عقل وشعور اور اُس فہم وحکمت کے استعمال کے ذریعے طے پائے جو قرآن وسنت سے حاصل ہوتا ہے۔ اسے اپنے آپ پر پورا کنٹرول حاصل ہو۔ کوئی قدم بھی شعوری فیصلے کے بغیر نہ اٹھے۔ جن اوصاف کو آج ہم قوت ارادی، ضبط نفس، ذاتی کنٹرول وغیرہ کہتے ہیں وہ سب صبر ہی کے ثمرات ہیں۔

جذباتیت یا بے صبری کیا ہے؟

جذبات جب بے قابو ہوجاتے ہیں تو آدمی کو اپنے آپ پر کنٹرول نہیں رہتا، وہ جذبات کا قیدی بن جاتا ہے۔ اس کا شعور معطل ہوجاتا ہے۔ حواس معذور ہوجاتے ہیں۔ سورج کی طرح روشن مناظر وہ نہیں دیکھتا، نوشتہ دیوار نہیں پڑھتا، فطرت کی بلند آہنگ صدائیں نہیں سنتا، اور دنیا ومافیہا اور امروز وفردا سے بے پروا ہوکر وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو جذبات کی اندھی آندھی اس سے کرانا چاہتی

ہے۔ یہ ایک طرح کا نشہ ہوتا ہے۔ نشے میں آدمی بے قابو ہو جاتا ہے، اپنی حرکات وسکنات پر اس کا کوئی کنٹرول باقی نہیں رہتا۔ نقصان کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب نشہ اتر جاتا ہے۔ اس وقت حقائق نظر آنے لگتے ہیں اور شدید پچھتاوا ہوتا ہے۔ یہی کیفیت جذبات سے بے قابو آدمی کی ہوتی ہے۔ یہی جذباتیت اور بے صبری ہے۔

جذبات بھی اللہ کی دین اور اس کی عطا ہیں۔ آدمی کے اندر غصہ اور غضب نہ ہو تو دنیا کی برائیاں اور ظلم وستم اس کے اندر کوئی ایسی بے چینی اور اضطراب پیدا نہیں کریں گے جو ان برائیوں سے مقابلے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے اندر حمیت وغیرت نہ ہو تو وہ اپنے خاندان اور دین کی ناموس کی حفاظت نہیں کر سکے گا۔ اس کے بالمقابل، اس کے اندر ڈر اور خوف کے جذبات نہ ہوں تو خطروں اور دشمنوں سے خود کو بچانا ممکن نہیں ہوگا۔ جنسی جذبہ، آدمی کے سکون وطمانیت اور نسلِ انسانی کی بقاو تسلسل کے لیے ضروری ہے۔ روزی کمانے کی خواہش اور بیوی بچوں سے محبت کے بغیر خاندان کے ادارے کی تعمیر و بقا ممکن نہیں ہے۔ یعنی جذبات کا انسانی زندگی میں نہایت مثبت رول ہے۔ اُن کا خاتمہ نہ تو ممکن ہے، نہ مفید اور نہ ہی مطلوب ہے۔ مطلوب یہ ہے کہ سارے جذبات، نقطہ اعتدال پر قائم رہیں اور دین کی تعلیمات کی روشنی میں عقل و شعور کے ذریعے ان کو قابو میں رکھا جائے۔ قابو میں رکھنے کی اس صلاحیت کا نام ہی صبر ہے۔

جذباتیت یا بے صبری، رد عمل کے رویے (reactive behaviour) کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یعنی ایسے لوگوں کا عمل، ان کی سرگرمی، ان کے معمولات، سب کچھ مکمل طور پر بیرونی قوتوں اور ان کے اقدامات پر منحصر ہوتے ہیں۔ عام دنوں میں وہ کچھ نہیں کریں گے مگر حکومت کے کسی غلط فیصلہ پر اچانک مشتعل ہو کر میدان میں آجائیں گے۔ لوگوں کو اپنی بات سمجھانے سے ان کو کبھی کوئی دل چسپی نہیں ہوگی لیکن کسی نے کوئی گستاخی کر دی تو غیض وغضب کی پوری شدت کے ساتھ رد عمل کا مظاہرہ کریں گے۔ یعنی ان کے عمل اور اقدام کا تعین دوسروں کے اعمال اور اقدامات سے ہوتا ہے۔

اس مزاج کے حامل لوگ ظالم استحصالی قوتوں کے لیے نرم چارہ اور سستے آلہ کار بنتے ہیں۔

ان قوتوں کے سیاسی مفاد کا تقاضا ہوگا تو وہ جب چاہیں گی ان کے جذبات کو بھڑکا کر یا مشتعل کر کے ان کے ذریعے اپنے من پسند حالات پیدا کر لیں گی۔ وہ غیر شعوری طور پر اپنے حریف کا مہرہ اور اس کے مفاد کی تکمیل کا ذریعہ بنیں گے۔ ان کی حرکات وسکنات دوسروں کی سوچ اور منصوبہ بندی کا نتیجہ ہوں گی اور بالآخر اپنے حریفوں ہی کو فائدہ پہنچائیں گی۔

اس کے مقابلے میں صبر، اقدامی رویّے (proactive behaviour) کا نام ہے۔ جس آدمی کے اندر صبر ہو وہ اپنی قدروں پر، اپنے اصولوں پر، اپنے مقصد و نصب العین پر استقامت کے ساتھ جمارہے گا۔ اس کے لیے ہر دم متحرک رہے گا۔ اس کو متحرک کرنے والی اور اس کی سمت کا تعین کرنے والی چیز بیرونی قوتیں نہیں بلکہ اصلاً اس کے اپنے اصول، اس کا نصب العین اور اس کی اقدار ہوں گی۔ وہ اپنے اصولوں کی بنیاد پر، شعور اور عقل کے استعمال سے، اپنے اقدامات کا تعین کرے گا۔ اس کا رویہ اور اس کے اقدامات، اس کی اپنی سوچ اور منصوبہ بندی کا نتیجہ ہوں گے۔

لیکن یہ بات بھی خاص طور پر پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ صرف اشتعال میں آجانا اور انتہا پسندانہ رویوں کا شکار ہوجانا ہی بے صبری نہیں ہے بلکہ ڈر جانا، اندیشوں کا شکار ہوجانا، پست ہمت ہوجانا بھی بے صبری ہے۔ اس لیے کہ ڈر بھی ایک جذبہ ہے۔ یہ جذبہ بھی جب غلط موقع پر پیدا ہوجائے، بڑھ کر بے قابو ہوجائے اور اُن کاموں کی راہ میں مزاحم ہوجائے جن کا عقل و شعور تقاضا کرتے ہیں تو یہ بھی بے صبری ہے۔ ڈر، خوف، بزدلی، مداہنت اور بے اصولی بھی رد عمل پر مبنی رویے ہی کی پیداوار ہے۔ اس طرح کے جذبات کے شکار لوگ بھی حریفوں کے لیے نرم چارہ ہوتے ہیں۔ ان کے اقدامات بھی ان کی سوچ اور منصوبہ بندی کا نہیں بلکہ شاطر استحصالی طاقتوں کی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

صبر طویل المیعاد مفاد کو ترجیح دینے کا نام ہے جب کہ بے صبری طویل المیعاد مفاد کو وقتی اکساہٹ اور مختصر المیعاد جذباتی تسکین پر قربان کر دینے کا نام ہے۔ قوموں اور گروہوں کی ترقی اور عروج کا راز یہ ہے کہ طویل المیعاد مفاد پر نظر رکھی جائے۔ طویل المیعاد مصالح کی خاطر فوری

درپیش مفادات کی قربانیاں دی جائیں۔ آنے والے کل کو دیکھا جائے۔ اس کے لیے اکساہٹوں، جذبات، اور اشتعال پر قابو رکھا جائے۔ ہر قدم سے پہلے یہ سوچا جائے کہ اس کا طویل مدت نتیجہ کیا ہوگا؟

صبر منزل پر نگاہوں کو جماتا ہے اور راستے کی الجھنوں میں اس طرح الجھنے نہیں دیتا کہ ہم منزل سے غافل ہو جائیں۔ صبر اس کی اجازت نہیں دیتا کہ مسافر راستے میں پڑے ہر پتھر اور ہر رکاوٹ کو دیکھ کر غصے سے بے قابو ہو جائے اور اور اس پر لاحاصل مکّے اور لاتیں مار کر خود کو زخمی کر لے اور آگے بڑھنے کے لائق نہ رہے۔ صبر مناسب موقع کے انتظار کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ مناسب موقع و محل کے میسر آنے تک اپنے آپ کو روکے رکھنا بھی صبر کے مفہوم میں داخل ہے۔ منزل کی طرف طویل سفر صراط مستقیم پر مستقل مزاجی کے ساتھ مسلسل آگے بڑھنے کا تقاضا کرتا ہے۔ بے صبری ہمیشہ ایسے موہوم شارٹ کٹ تلاش کرتی ہے جو منزل سے دور کر دیتے ہیں، جن پر اچانک بگ ٹٹ دوڑ ہمیں بے دم کر کے سفر کے لائق نہیں چھوڑتی۔

صبر کی یہ زبردست صفت اگر اجتماعی طور پر پوری قوم یا کسی گروہ میں پیدا ہو جائے تو ایک بڑی طاقت بن جاتی ہے۔ یہ طاقت اسے سماجی طاقت (social power) فراہم کرتی ہے۔ یہ ان طاقتوں میں سے ایک ہے جن کے بغیر کوئی بھی گروہ کسی لمبی جدوجہد اور کش مکش میں ٹک نہیں سکتا۔ اسی لیے قرآن مجید نے اسے کام یابی و سربلندی کے لیے ایک لازمی صفت قرار دیا ہے۔

صبر اور سیرت نبوی ﷺ

نبی کریم ﷺ کو ہر مرحلے میں اللہ تعالیٰ نے صبر کا حکم دیا اور آپ کی سیرت کے مطالعے سے آپ کے ذاتی کردار میں بھی اور آپ کی اجتماعی حکمتِ عملی میں بھی صبر کی صفت نہایت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مکی زندگی میں آپ نے لمبے عرصے تک دشمنوں کی ایذا رسانیوں، طعنوں اور پھبتیوں کے مقابلے میں صبر کیا۔ کبھی مشتعل نہیں ہوئے۔ اپنے آپ کو روکے رکھا۔ آپ کی نگاہوں کے سامنے اسلام لانے والوں کو اذیتیں دی گئیں۔ ان کو شہید کیا گیا۔ آپ کے پورے

خاندان کو لمبے عرصے تک شعب ابی طالب کے حصار میں رہنا پڑا۔ آپ صبر کے ساتھ مناسب موقع کا انتظار فرماتے رہے اور اپنے اصل کام یعنی دعوتِ دین کی طرف متوجہ رہے۔ اسی طرح آپ کو لالچ دینے کی کوشش کی گئی۔ بادشاہت، دولت، حسین ترین عورت سے نکاح، غرض ہر طرح کی پیش کش کی گئی۔ اپنے اصل مقصد و نصب العین اور اپنی قدروں اور اصولوں کی خاطر، ایسی ترغیبات کو مسترد کرنا بھی صبر ہی کا مظہر ہے۔

طائف میں آپ پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔ ان کے مقابلے میں بھی آپ نے صبر فرمایا۔ نبی کریم ﷺ نے اس مرحلے میں ظالموں کی سرکوبی کے لیے طاقت کے استعمال کی کوشش نہیں کی۔ اس وقت اپنے آپ کو روکے رہے کہ یہی عقل و شعور کا تقاضا تھا۔ جب مدینہ میں مسلمان منظم ہوئے، ان کی ریاست تشکیل پائی اور ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے آپ کو اللہ نے جنگ کی اجازت دی تو پھر طویل انتظار اور صبر کے بعد اہلِ اسلام کو ظالموں کی سرکوبی کا موقع ملا لیکن اس موقع پر بھی صبر کا بڑا امتحان لیا گیا۔ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کے مقابلے میں حق و انصاف کی خاطر تلوار اٹھانا آسان نہیں تھا، اس کے لیے بھی جذبات پر غیر معمولی قابو درکار تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہؓ نے اس امتحان میں بھی صبر کی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔

مدینہ میں منافقوں نے طرح طرح کی سازشوں کا بازار گرم کیا اور بڑے بڑے فتنے کھڑے کیے۔ غزوہ احد میں صریح غداری کی اور مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ منافقوں نے آپ کی محبوب زوجہؓ پر تہمت لگائی اور ایک ماہ تک مدینے میں فتنوں کا ایسا بازار گرم کیا کہ آپ شدید پریشانی کے شکار رہے۔ حتیٰ کہ مسجد ضرار کی تعمیر کر کے گویا آپ کی لیڈرشپ کو کھلا چیلنج کیا اور گروہ بندی کی کوشش کی۔ ان سب وجوہ سے ان منافقوں کی سرکوبی اور ان کے سرداروں کے قتل کی پرزور مانگ اکابر صحابہ تک کرتے رہے لیکن اس وقت حکمت عملی کا تقاضا یہی تھا کہ ان کے خلاف جنگ کر کے کلمہ گو انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم نہ ہونے دیا جائے۔ یہ صبر کی نہایت اعلیٰ مثال ہے کہ طاقت کے باوجود دین اور مقصد کے طویل المیعاد مفاد کو سامنے رکھ کر ایسے شرپسندوں کو برداشت کیا گیا اور

ان کی سرکوبی اور سزا دینے کے فطری داعیے پر نہایت تحمل کے ساتھ قابو رکھا گیا۔ اور ان کے فتنے کے مقابلے کی متبادل حکمت عملی اختیار کی گئی۔

فتح مکہ کے بعد آپ نے اُن سب سرداران قریش کو معاف کر دیا جن کے ظالمانہ رویوں کے ساتھ آپ کی انتہائی تلخ یادیں وابستہ تھیں۔

اس طرح سیرت رسول صبر کی متعدد قسموں کا انتہائی خوب صورت عملی نمونہ ہے۔ اس میں ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بہت سارے سبق موجود ہیں۔

ہندوستانی مسلمان اور صبر

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی حالیہ تاریخ میں خود کو سب سے زیادہ نقصان اپنی جذباتیت سے پہنچایا ہے۔ یہ شدتِ جذبات ہی ہے جو ہم میں سے بعض پر انتہا پسندی کا بخار طاری کر دیتی ہے اور بعض پر مایوسی و قنوطیت کا مالیخولیا۔ اسی شدت کی وجہ سے ہم اپنے پسندیدہ لوگوں کی خرابیوں کو نہیں دیکھ پاتے اور ناپسندیدہ لوگوں کی خوبیوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اسی شدت کی وجہ سے ہم دنیا اور اس کی ہر چیز کو سیاہ اور سفید کے انتہائی خانوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ اسی شدت کے نتیجہ میں ہم یہاں کے اکثریتی طبقہ کے ذہن اور جذبات کو نہیں سمجھ پاتے اور نہ ان سے کمیونیکیٹ کر پاتے ہیں۔ یہ جذباتیت ہی ہے کہ ناگوار حالات و واقعات پر ہمارا ردعمل فوری اور غیض وغضب کی پوری قوت کے ساتھ ہوتا ہے، لیکن اصلاحِ احوال کی سنجیدہ، دھیمی اور طویل المیعاد کوششوں کے لیے ہم خود کو تیار نہیں کر پاتے۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ قیادت کا عمل بھی زیادہ تر عوامی جذبات کی ترجمانی بن کر رہ گیا ہے، الا ماشاء اللہ۔ قیادت تبدیلی کے وژن کا نام ہے۔ صحیح قیادت وہ ہے جو موجود کو بدلنے کا خواب دکھائے، اس کا راستہ روشن کرے اور اس پر چلنے کا حوصلہ پیدا کرے۔ یہ ہماری قیادتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ امت کے اندر سنجیدہ مزاج پیدا کریں۔ عوام کو جذبات کے ریلے میں بہنے نہ دیں۔ خود کو عوام کے بے لگام جذبات کے تابع نہ کریں بلکہ عوام کی تربیت کریں اور ان کے اندر ٹھنڈے دل ودماغ کے

ساتھ سوچنے اور کام کرنے کی صلاحیت بیدار کریں۔ اس کے لیے ضرورتاً سخت فیصلے کریں۔ وقتی طور پر عوام کی ناراضی بھی برداشت کریں۔ پاپولزم (عوام پسندی) بھی قیادت کی سطح پر بے صبری کا مظہر ہے۔ سخت حالات میں قیادتوں کا پاپولزم کا شکار ہوجانا نہایت ہلاکت خیز ہوتا ہے۔

بے صبری کے مختلف مظاہر اور صبر کا مطلوب رویہ

ذیل میں بعض ان رویوں کی نشان دہی کی جارہی ہے جو ہمارے خیال میں صبر کی اسپرٹ کے خلاف ہیں اور جو ہماری کمزوری اور پستی کے اسباب میں بھی شامل ہیں۔

❶ **اپنے مقام اور حیثیت کو فراموش کردینا** یہ بات اہل اسلام کے عقیدہ اور ان کے فلسفہ دین کا حصہ ہے کہ اس ملک میں مسلمان یہاں کے مختلف باہم متحارب نسلی گروہوں (یا ذاتوں) میں سے ایک گروہ نہیں ہیں۔ عام غیر مسلم ہمیں یہی سمجھتے ہیں اور ہمارے رویّوں سے بھی اسی کا اظہار ہوتا ہے، لیکن قرآن وسنت اس معاملے میں بہت واضح ہیں کہ مسلمان اصلاً ایک ایسا گروہ ہیں جس کا امتیاز نسل، ذات یا قوم نہیں بلکہ اس کا عقیدہ، نظریہ زندگی اور اس کی قدریں ہیں۔ وہ ایک مشن اور مقصد رکھنے والی امت ہیں یعنی ایک ایسا گروہ جس کی رکنیت رضاکارانہ ہے اور اس مشن سے اتفاق اور وابستگی پر مبنی ہے۔ جب ہم مسلمانوں کو غیر شعوری طور پر ایک نسلی گروہ یا یہاں کے مختلف باہم متحارب طبقات میں سے ایک طبقہ سمجھنے لگتے ہیں تو ساتھ رہنے والے دیگر افراد ان کے لیے اجنبی بن جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ غیریت کا یا کش مکش کا تعلق قائم ہوجاتا ہے۔ وہ اپنا الگ گھیتو بنالیتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ان کے اندر یا قومی کا پیغمبرانہ اور داعیانہ سوز نہیں پیدا ہوپاتا۔

اس امت کا اصل مفاد اس کے عقیدے، اس کی اقدار اور اس کے مشن کا مفاد ہی ہے۔ بے صبری یا جذباتیت ہم کو اس مشن پر قائم رہنے نہیں دیتی۔ ہم فرقوں میں ایک فرقہ، قوموں میں ایک قوم، ذاتوں میں ایک ذات بن جاتے ہیں۔ قومی عصبیت اور انا مقدم ہوجاتی ہے اور مشن اور مقصد کے تقاضے پیچھے ہوجاتے ہیں۔ صبر یہ ہے کہ ہم پوری استقامت کے ساتھ خیر امت کے

اپنے مقام پر ڈٹے رہیں۔ اس ملک میں اللہ کے دین کی دعوت کا مشن ہمیں سب باتوں سے زیادہ عزیز ہو اور اس کا مفاد سب سے مقدم ہو۔

❷ **واقعات واحوال کو دیکھنے میں شدت پسندی** بے صبری یا جذباتیت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ حالات وواقعات اور مسائل کو دیکھنے کا ہمارا زاویہ نظر حقیقت پسندانہ نہیں رہتا۔ حالات، واقعات، شخصیات وغیرہ کے سلسلہ میں رائے قائم کرنے کا معقول اور علمی طریقہ یہ ہے کہ ہم پہلے صحیح معلومات اصل سورس سے حاصل کرنے کی کوشش کریں، مسئلہ کے تمام فریقوں کا موقف اور ان کے دلائل کو جانیں، اس کے بعد ٹھنڈے دماغ سے ہر طرح کی عصبیت کی عینک اتار کر معاملہ کو دیکھیں اور کوئی رائے قائم کریں۔ اس وقت دنیا میں جس طرح کی کش مکش جاری ہے اس میں ایک دوسرے کے حریف ایک دوسرے کے بارے میں طرح طرح کی غلط باتیں پھیلاتے رہتے ہیں۔ انٹرنیٹ، وہاٹس اپ اور سوشل میڈیا ان بے بنیاد باتوں کی ترویج واشاعت کا آسان ذریعہ ہیں۔ ان باتوں پر بغیر تحقیق کے یقین کرلینا اور ان کو پھیلانے میں شامل ہونا نہایت غیر ذمہ دار اور غیر اسلامی رویہ ہے۔ سنجیدہ اور گہرے معاملات میں صرف اخباری اطلاعات یا وہاٹس اپ کے بے اصل پیغامات پر انحصار کرنا، مجہول ویب سائٹوں میں شامل نامعلوم لوگوں کے مضامین کو اپنی رائے کی بنیاد بنانا، اپنے طے شدہ خیالات اور عصبیتوں کی بنیاد پر موقف کی عمارت کھڑی کرنا، تمام فریقوں کی بات سنے بغیر رائے قائم کرنا وغیرہ غیر عادلانہ رویے ہیں اور ان سے انتہا پسندانہ آراہی جنم لیتی ہیں۔

اس دنیا میں اکثر امور ومعاملات میں اچھے اور برے عناصر کی آمیزش ہوتی ہے۔ یعنی ہر چیز سیاہ یا سفید نہیں ہوتی بلکہ اکثر معاملات گرے (grey) کے مختلف شیڈ ہوتے ہیں اگر ہم خیر وشر کے عناصر کو صحیح تناسب میں نہیں دیکھیں گے تو دھوکہ کھاجائیں گے اور ایسے دھوکے ہم کثرت سے کھاتے ہیں۔ ہلکے سے مخالفانہ بیان پر ہم سرعت سے کارآمد دوست کو دشمن کے خیمے میں پہنچادیتے ہیں۔ گرے کا ہلکا شیڈ بھی ہم کو سیاہ ہی نظر آتا ہے۔ شدید سے شدید واقعہ اور تباہ کن سے تباہ کن

حادثہ بھی خیر اور مصلحت کے پہلو اپنے اندر رکھتا ہے۔ اسی طرح ہمارے پسندیدہ امور اور واقعات میں بھی شر اور فساد کے پہلو پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ہماری محبوب شخصیتوں میں بھی انسانی کم زوریاں پائی جاتی ہیں۔ ناپسندیدہ امور، اشیا اور شخصیتوں کے اچھے پہلوؤں اور پسندیدہ امور کے خراب پہلوؤں کو دیکھنے کی صلاحیت اعتدال پسند مزاج کی اہم خصوصیت ہوتی ہے۔ پسند وناپسند اور محبت و نفرت میں شدت (strong likes and dislikes) آدمی کو اندھا بنادیتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں ہمارے تجزیے غلط ہوجاتے ہیں اور تباہ کن فیصلوں اور اقدامات کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اس وقت خاص طور پر یہ صورت حال درپیش ہے کہ حکومت میں موجود عناصر کی ذہنیت اور ان کے غلط روّیوں کی وجہ سے ان کی جانب سے آنے والی کسی بھی بات کو منصفانہ اور معروضی طریقے سے دیکھنے کے ہم روادار نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ روّیہ کسی اور کے لیے نہیں خود ہمارے لیے نقصان دہ ہے۔ سوچ کا یہ ضرر رساں زاویہ مزاج کی بے صبری ہی کا نتیجہ ہوتا ہے، یعنی جذبات کے غلبے اور عقل و شعور کی زیر دستی ہماری آنکھوں پر عینکیں چڑھادیتی ہے اور حقیقی منظر دھندلا جاتا ہے۔

عمل کی زمین پر کوئی بھی تبدیلی تدریج کے ساتھ ہی ہوسکتی ہے۔ آج جو مسائل ہم کو درپیش ہیں وہ برسہابرس کے حالات کا نتیجہ ہیں۔ ہماری برسوں کی غفلتیں، کوتاہیاں اور غلطیاں بھی اس کے لیے ذمہ دار ہیں۔ حریف قوتوں کی طویل اور صبر آزما جدوجہد کا بھی ان حالات کو پیدا کرنے میں اہم رول ہے۔ اب ہم کمپیوٹر کا بٹن دباکر اچانک حالات کا رخ نہیں بدل سکتے۔ طویل اور صبر آزما جدوجہد کے لیے ہمیں خود کو تیار کرنا ہوگا۔ اس دوران پیش آنے والی مشکلات کو برداشت کرنا ہوگا۔ اس کے لیے بھی صبر درکار ہے۔

❸ احساس مظلومیت (sense of victimhood) کی شدت: عقل و شعور اور تجزیہ و تحلیل پر جذبات کے غلبے کے نتیجے میں ایک اور صورت حال پیدا ہوئی ہے جسے ہم احساس مظلومیت کی شدت کہہ سکتے ہیں۔ اس ملک میں اہل اسلام کے ساتھ مظالم ہوتے رہے ہیں، تعصب ہوتا رہا ہے اور ان کے لیے حالات پریشان کن رہے ہیں، یہ بے شک ناقابلِ تردید حقیقت

ہے۔ لیکن ان باتوں کو اتنا ہی دیکھنا اور دکھانا چاہیے جتنی وہ واقعی ہیں۔ مظالم وناانصافیوں کا بہ تکرار تذکرہ، سازشوں کا مبالغہ آمیز بیان اور مضحکہ خیز حد تک مشکوک سازشی نظریات کی تکرار، باطل کی طاقت کو بہت زیادہ سمجھنا اور خود کو حد سے زیادہ کم زور اور بے بس باور کرانا، بے بسی ولاچاری کا پیہم ماتم، ان سب باتوں سے ایک عام نوجوان کے اندر غیر حقیقت پسند احساس مظلومیت پروان چڑھتا ہے۔ اسے سارے راستے بند نظر آنے لگتے ہیں، اور امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی۔ یہ احساسِ عدم تحفظ بہت ہی خطرناک چیز ہے۔ اگر اسے روک نہ لگے تو یہ ہماری ترقی، ہمارے حوصلے اور عزائم اور مقابلہ کرنے کی امنگ اور آگے بڑھنے کے ولولے پر روک لگا سکتا ہے۔

آپ آزادی کے بعد سے مختلف ادوار کی مسلم صحافت اور قائدین کے بیانات کا جائزہ لے لیجیے۔ ہر زمانے میں یہی کہا گیا کہ حالات اتنے خراب کبھی نہیں تھے۔ ظلم کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں، ملت کا وجود خطرے میں ہے، کشتی منجدھار میں ہے۔ کیا اس زبان کا مسلسل استعمال اس امت کو زیب دیتا ہے جو مزمل و مدثر اور والضحی اور الم نشرح جیسی سورتیں پڑھتی ہے اور صبر کے فلسفے میں یقین رکھتی ہے؟ بے صبری حالات کی خرابی کو ہماری نگاہوں کا مرکز بنا دیتی ہے، جب کہ صبر بہتر حالات کے خواب اور ان کو پیدا کرنے کے عملی لائحہ عمل پر توجہات کو مرکوز کرتا ہے۔

بے شک ملک میں چیلنج درپیش ہیں۔ لیکن چیلنج تو ہر جگہ ہیں، نوعیتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ ٹھیک ہے کہ اس وقت حالات کا رخ، اہل اسلام کے خلاف بہت شدت اختیار کر چکا ہے لیکن ایسے سخت حالات کی لہریں دوسرے طبقات کے خلاف بھی تاریخ میں آچکی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دنیا ایسی ہی ہے۔ سب کو انصاف کہیں بھی نہیں ملتا۔ ہر جگہ ناانصافیاں ہیں، استحصال ہے، ظلم ہے، اور اسی کے درمیان اس کا مقابلہ کرتے ہوئے ہی زندگی گزارنی ہے۔ یہ رب العالمین کی مشیت کا حصہ اور اس ناقص دنیا (کامل تو دار آخرت ہے) کا مستقل وطیرہ ہے۔ ہمیں اسے بدلنے اور ظلم کا مقابلہ کرنے کی کوشش ضرور کرنی ہے۔ لیکن اس صورتِ حال سے گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ ہر چیلنج کے ساتھ مواقع وابستہ ہوتے ہیں۔ راستے پر چلنے والے ہر شخص کو حادثات کا خطرہ

لاحق ہوتا ہے۔ دور دراز منزلوں اور پر خطر راہوں کے مسافروں کے لیے یہ خطرہ عام مسافروں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ مسلمان ایسے ہی مسافر ہیں۔ ان کے بلند نظریات اور اونچا مشن ان کو زیادہ خطرات سے دوچار کرتا ہے۔

❹ ترجیحات کے شعور سے محرومی اور نان ایشوز میں الجھ کر رہ جانا: بے صبری ہم کو ترجیحات کے شعور سے محروم کر دیتی ہے۔ مولانا سلیمان ندویؒ کا ایک اقتباس ان دنوں بہت گردش کرتا رہا جو ہماری حالیہ تاریخ کی نہایت حقیقت پسندانہ ترجمانی ہے۔

> مسلمانوں کی ترقی اور تنزلی، دونوں کا ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے ان کا فوری اور وقتی جوش۔ وہ سیلاب کے مانند پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں، لیکن کوہ کن کی طرح ایک ایک پتھر کو جدا کر کے راستہ صاف نہیں کر سکتے۔ وہ بجلی کے مثل ایک آن میں خرمن کو جلا سکتے ہیں، لیکن چیونٹی کی طرح ایک ایک دانہ نہیں ڈھو سکتے۔ وہ ایک مسجد کی مدافعت میں اپنا خون پانی کی طرح بہا سکتے ہیں، لیکن کسی منہدم مسجد کو دوبارہ بنانے کے لیے مستقل کوشش جاری نہیں رکھ سکتے... ہندوستان کی سیاسی بساط پر اس وقت جو بازی کھیلی جارہی ہے، ہم کو یقین نہیں کہ مسلمان اس کے اچھے شاطر ثابت ہوسکیں کیوں کہ یہ وہ میدان ہے جو ایک ایک قدم گن کر آگے بڑھانے سے جیتا جا سکتا ہے اور ایک دوڑ میں آگے بڑھ جانے کی کوشش میں مات سامنے رکھی ہے... ہماری ناکامی کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم آندھی کی طرح آتے ہیں، اور بجلی کی طرح گزر جاتے ہیں۔ ہم کو دریا کے اس پانی کے مانند ہونا چاہیے جو آہستہ آہستہ بڑھتا ہے اور سالہا سال میں کناروں کو کاٹ کر اپنا دہانہ وسیع کرتا جاتا ہے۔ کام یابی صرف مسلسل اور پائیدار کوشش میں ہے۔ ہمالیہ کی برفانی چوٹیاں آہستہ آہستہ پگھلتی ہیں، لیکن کبھی جمنا اور گنگا کو خشک ہونے نہیں دیتیں۔ آسمان کا پانی ایک دو گھنٹے میں دشت و جبل کو جل تھل بنا دیتا ہے لیکن چند ہی روز میں ہر طرف خاک اڑنے لگتی ہے۔[۳]

اس ملک میں اسلام کے تعلق سے رائے عامہ کو مثبت طور پر متاثر کرنے کی کوشش ہمارے مشن اور مقصد کا بھی تقاضا ہے اور اس ملک میں بقا و ترقی کے لیے بھی ضروری ہے۔ ملک کی عظیم اکثریت اگر آپ کو انتہا پسند یا دہشت گرد سمجھے، آپ کے دین، آپ کے پیغمبر اور آپ کی کتاب کے

تعلق سے طرح طرح کی غلط فہمیوں کی شکار رہے، آپ کی حکم رانی کی تاریخ کو اپنے تمام مسائل کی جڑ سمجھے اور آپ کے وجود کو ملک کے لیے بوجھ سمجھے تو ایسے حالات میں آپ کیسے خوش رہ سکتے ہیں؟ ان غلط فہمیوں کو دور کرنا اور اسلام کے تعلق سے مثبت رائے بنانا آپ کی سب سے اہم ضرورت بن جاتی ہے۔

مسلمانوں کی اہم ترین ضرورت یہ بھی ہے کہ وہ اسلام کا نمونہ بنیں اور ان کا معاشرہ اسلام کی عملی شہادت دینے والا بنے۔ مسجد کی حفاظت یقیناً اہم ہے لیکن یہ بھی بہت اہم ہے کہ خود مسلمان مسجد کا حق ادا کریں۔ شریعت کے تحفظ کے مسئلے پر جتنا ہم حساس ہو جاتے ہیں، اتنے حساس خود اپنی زندگیوں میں شریعت کی مسلسل پامالی پر نہیں ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ کا احترام غیر مسلموں سے کہیں زیادہ خود مسلمانوں پر واجب ہے اور اس احترام کا سب سے بڑا تقاضا آپ کی اطاعت اور آپ کے مشن کی نصرت ہے۔ کسی مسلمان لڑکی کا غیر مسلم کے ساتھ چلے جانا یقیناً افسوس ناک ہے لیکن یہ بھی نہایت افسوس ناک ہے کہ مسلم معاشرہ عورتوں کے جائز حقوق سے لاپروا رہے اور خود اپنی بیٹیوں کو اپنے معاشرے سے متنفر کر دے۔

اسی طرح اس ملک میں مسلمانوں کے مسائل کا ایک بڑا سبب ان کا ضعف اور ان کی کم زوری ہے۔ سماجی کم زوری قوت مدافعت کو کم کر دیتی ہے۔ اس کم زوری کو دور کرنے کے لیے تعلیم، معیشت، وغیرہ میں منصوبہ بند ترقی ہماری اہم ضرورت ہے۔ جب تک ہم ان محاذوں پر سنجیدہ کام کر کے سماجی قوت پیدا نہیں کریں گے ہمارا ضعف اور ستم پذیری (vulnerability) دور نہیں ہوگی۔ ضعف اور ستم پذیری عروج و ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ ؏ ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

5 عدل اور عادلانہ رویّوں سے دوری: اسلام کی سب سے اہم قدر عدل ہے۔ اہل ایمان کو ہر حالت میں عدل کرنے اور عدل و قسط کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن نے نہایت صاف لفظوں میں تاکید کی ہے کہ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ

شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔ سورہ مائدہ، آیت ۸) اس آیت کی موجودگی میں ہمارے لیے یہ بالکل ممکن نہیں ہے کہ کسی بھی قسم کے تعصب میں ہم کسی کے خلاف غیر عادلانہ رویہ اختیار کریں۔ صبر کا رویہ یہ ہے کہ ہم عدل پر پوری استقامت کے ساتھ جم جائیں۔ دوسرے ہمارے ساتھ ناانصافی کریں تو ہم ضرور انصاف کے حصول کی کوشش کریں لیکن جوابی ناانصافی ہرگز نہ کریں۔ بے گناہ کے خون پر ہمارا دل دکھے، چاہے اس کا تعلق کسی بھی فرقہ سے ہو۔ کسی کے جرم کی سزا مناسب عدالتی عمل کے بغیر نہ دی جائے، چاہے وہ جرم اسلام کی توہین جیسا جرم ہی کیوں نہ ہو، قانون کو ہرگز ہاتھ میں نہ لیا جائے۔ یہ سب عدل کے تقاضے ہیں۔ اور اسلام کی اہم قدریں ہیں۔ ان قدروں پر استقامت کے ساتھ جمنا اور ان کی راہ میں حائل جذبات پر قابو رکھنا یہی صبر ہے۔ اس کے بغیر اسلام کی انسانیت دوست اور عدل پسند تعلیمات کی ہم نہ نمائندگی کر سکتے ہیں اور نہ شہادت دے سکتے ہیں۔

6 اپنے عمل اور اقدامات کے حاصل یا انجام (outcome) سے لاپروائی:

صبر کا رویہ یہ ہے کہ اگر سخت حالات درپیش ہوں تو ہم جذبات سے بے قابو ہوئے بغیر یہ سوچیں کہ ہمارے کس قدم کا حاصل کیا ہو سکتا ہے؟ کس تقریر کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے؟ فیس بک کی کس پوسٹ کا انجام کیا ہو سکتا ہے؟ کس بیان کا اثر کیا ہو سکتا ہے؟ بے شک ہمارے بعض جذباتی رویوں سے، تقریروں سے، نعروں سے اور اقدامات سے ہمارے جذبات کی تسکین ہو سکتی ہے۔ امت کے جذباتیت پسند عناصر سے تعریف و تحسین بھی مل سکتی ہے۔ لیکن کیا اس سے ہمارے مقصد اور مشن کو کوئی فائدہ ہو سکتا ہے؟ کیا زیرِ نظر مسئلے کو حل کرنے میں اس سے مدد مل سکتی ہے؟ ناعاقبت

اندیش بیانوں، اشتعال انگیز تقریروں، لاحاصل احتجاجی مہموں اور نمائشی مزاحمتوں کے ذریعے ہماری ملت میں معمولی صلاحیت کے لوگ بھی آسانی سے ہیرو بن جاتے ہیں۔ ہیرو اور قائد بن جانے کے اس شارٹ کٹ کی امت کی جانب سے بھی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے اور قیادت کی جانب سے بھی۔ اس طرح کے رجحانات ہمارے اکثر ملی سانحوں کی ذمہ دار ہیں۔ بے شک احتجاج اور مزاحمت کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ اس وقت کے حالات میں یہ ضرورت بڑھ گئی ہے۔ لیکن ہم جو بھی کریں وہ حاصل یا انجام کو سامنے رکھ کر سوچے سمجھے شعوری فیصلے کا نتیجہ ہو نہ کہ وقتی جذباتی ابال اور اشتعال انگیز خطابت کا۔

(زندگی نو، ستمبر ۲۰۲۰)

حواشی و حوالہ جات

۱۔ المفردات فی غریب القرآن: کتاب الصاد، صبر

۲۔ احیاء علوم الدین، الربع الرابع، کتاب الصبر والشکر بیان حقیقة الصبر و معناه

۳۔ معارف جلد ۲ نمبر ۴ ص ۲،۱ اور ۳

توکل، تدبیر اور امّت کا اجتماعی رویہ

امت مسلمہ کی کام یابی وسربلندی کے لیے صبر کی صفت کے ساتھ ایک اور اہم صفت، جسے قرآن ضروری قرار دیتا ہے، وہ توکل علی اللہ کی صفت ہے۔ صبر کی طرح توکل کی صفت بھی ایک خاص مزاج اور سوچ کا ایک خاص سانچہ تشکیل دیتی ہے۔ صبر کی طرح یہ عظیم اسلامی صفت بھی طرح طرح کی غلط فہمیوں اور غلط تعبیرات کے جنگل میں گم ہوکر رہ گئی ہے اور آج ہمارے اجتماعی رویے توکل کے اسلامی فلسفے اور اس کی حقیقی اسپرٹ سے بہت دور محسوس ہوتے ہیں۔ ذیل کی سطروں میں ہم توکل کی صفت اور اس کے فلسفے پر بھی روشنی ڈالیں گے اور اس بات کو بھی زیر بحث لائیں گے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے راہ عمل کے تعین میں توکل کے فلسفے سے کیا روشنی ملتی ہے؟

توکل کی اہمیت

قرآن مجید میں تقریباً ۴۲ مرتبہ توکل کا ذکر آیا ہے اور اس صفت کو اللہ پر ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا گیا ہے۔

إِن كُنتُمْ آمَنتُم بِاللهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوا إِن كُنتُم مُّسْلِمِينَ (اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اس پر بھروسا کرو اگر مسلمان ہو۔ سورہ یونس، آیت ۸۴)

توکل کو آخرت کی کام یابی کے لیے بھی ضروری قرار دیا گیا ہے اور دنیا کی کام یابی کے لیے بھی۔ جب طاقت ور باطل سے مقابلہ درپیش ہو تو کہا گیا کہ توکل سے کام لو۔

إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (اللہ تمھاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں، اور وہ تمھیں چھوڑ دے، تو اس کے بعد کون ہے جو تمھاری مدد کر سکتا ہو؟ پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۶۰)

شدید مشکلات درپیش ہوں اور ان سے نکلنے کا کوئی راستہ سجھائی نہ دے رہا ہو تو حکم ہوا کہ اللہ پر توکل کرو، وہ مشکلات سے نکلنے کا راستہ پیدا کر دے گا۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا. وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (اور جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اُس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔ اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اُس کا گمان بھی نہ جاتا ہو جو اللہ پر بھروسا کرے اس کے لیے وہ کافی ہے۔ سورہ طلاق، آیت ۲ اور ۳)

مصیبت یا تکلیف درپیش ہو تو رہ نمائی کی گئی کہ اس حالت میں بھی اللہ ہی پر توکل کرو۔

قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (ان سے کہو ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے، اور اہل ایمان کو اسی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ سورہ توبہ، آیت ۵۱)

حالات کے ہر قسم کے رسپانس کے ساتھ قرآن نے توکل کو اس طرح جوڑا ہے کہ توکل، حالات و واقعات کے سلسلے میں مومنانہ سوچ اور رویے کا اہم ترین عنوان نیز چیلنجوں اور مسائل میں مومنانہ ردعمل کا نمایاں ترین مظہر اور امت مسلمہ کی اجتماعی نفسیات کا اساسی حوالہ بن جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ دین کے انتہائی مشکل مرحلے میں کہا گیا کہ دعوت دیتے رہو اور اللہ پر توکل کرو۔ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا (وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے، اُس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے، لہٰذا اُسی کو اپنا وکیل بنالو [یا اسی پر توکل کرو] سورہ مزمل، آیت ۹) کہا گیا کہ دعوت الی اللہ، تمہارا اصل مشن اور مقصد ہے، یہ کام کرتے رہو۔ اس کی پروا نہ کرو کہ لوگ مانتے ہیں یا نہیں، تمھارا کام بس بشارت دینا اور ڈرانا ہے، یہ کام کرو اور نتیجہ اللہ پر چھوڑو اور اس پر توکل کرو۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ وَكَفٰى بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا (اور اے محمد ﷺ، اُس پر بھروسا رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں اس کی حمد کے ساتھ

اس کی تسبیح کرو اپنے بندوں کے گناہوں سے بس اُسی کا باخبر ہونا کافی ہے۔ سورہ فرقان، آیت ۵۸)

منافقوں کی ریشہ دوانیوں کا ذکر کر کے کہا گیا کہ اُن سے اعراض کرو، اُن کی سازشیں تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گی اور اللہ پر توکل کرو۔

وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيلًا (اللہ لکھ رہا ہے جو سرگوشیاں وہ کر رہے ہیں۔ تو ان سے اعراض کرو اور اللہ پر بھروسا رکھو اور اللہ بھروسے کے لیے کافی ہے۔ سورہ نساء، آیت ۸۱)

جنگ کرو تو اللہ پر توکل کر کے کرو۔ غزوہ احد کے پس منظر میں کہا گیا کہ

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ (اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو، پھر جب تمھارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسا کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اُسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۵۹)

اور جب صلح کرو تو بھی اللہ پر توکل کر کے ہی کرو۔

وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (اور اے نبی، اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسا کرو، یقیناً وہی سننے اور جاننے والا ہے۔ سورہ انفال، آیت ۶۱)

قرآن نے جلیل القدر انبیا کی مثالیں پیش کیں کہ انھوں نے اپنی جدوجہد کے ہر مرحلے میں اللہ پر توکل کیا۔ اپنے مقصد و نصب العین اور اپنے اصولوں پر سخت ترین حالات میں استقامت کے ساتھ جمے رہنے کی صلاحیت توکل ہی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ شعیب علیہ السلام کی قوم کے لوگوں نے جب ان سے کہا کہ اگر تم ہمارے دین و ملت میں لوٹ کر نہ آؤ تو ہم تمھیں ملک بدر کر دیں گے، یا اپنی بستی سے نکال دیں گے تو شعیب علیہ السلام نے جواب میں یہی کہا کہ

عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ (اللہ پر ہم نے توکل کر لیا اے رب، ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک فیصلہ کر دے

اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ سورہ اعراف، آیت ۸۹)

نوح علیہ السلام کی مسلسل دعوت سے ان کی قوم نے بیزاری کا اظہار کیا تو انھوں نے صاف صاف چیلنج کر دیا کہ

إِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُم مَّقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنظِرُونِ (اگر میرا تمھارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات سُنا سُنا کر تمھیں غفلت سے بیدار کرنا تمھارے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا ہے تو میرا بھروسا اللہ پر ہے، تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک متفقہ فیصلہ کرلو اور جو منصُوبہ تمھارے پیشِ نظر ہو اس کو خوب سوچ سمجھ لو تا کہ اس کا کوئی پہلو تمھاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے، پھر میرے خلاف اس کو عمل میں لے آؤ اور مجھے ہر گز مہلت نہ دو۔ سورہ یونس، آیت ۷۱)

یہی بات ہود علیہ السلام نے بھی دعوت دین کے دشمنوں سے کہی کہ تمھیں جو کرنا ہو کرلو، میں اپنی دعوت سے باز نہیں آؤں گا۔ میں اللہ پر توکل کرتا ہوں۔

فَكِيدُونِي جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنظِرُونِ. إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّي وَرَبِّكُم مَّا مِن دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (تم سب کے سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کسر نہ اٹھا رکھو اور مجھے ذرا مہلت نہ دو۔ میرا بھروسا اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ کوئی جان دار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو، بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے۔ سورہ ہود، ۵۵ اور ۵۶)

توکل کا مفہوم اور اس کا فلسفہ

اسلامی لٹریچر میں توکل علی اللہ کی تعریف کئی طرح سے کی گئی ہے۔ اللہ پر بھروسا، اپنے معاملے کو اللہ کے حوالے کر دینا، مخلوق کی جانب سے پہنچنے والی تکلیف یا مایوسی کو اہمیت نہ دینا، اللہ کی مرضی پر راضی رہنا وغیرہ کچھ اہم تعریفیں ہیں۔ ہمارے خیال میں سب سے جامع تعریف وہ ہے جو مشہور مورخ و مفسر، علامہ ابن جریرؒ نے کی ہے۔ الثقة باللّٰه تعالى والاعتماد في الأمور، وتفويض كل ذلك إليه بعد استفراغ الوسع في السعي (تمام معاملات میں اللہ پر بھروسا اور اعتماد اور تمام تر تدبیر و کوشش کر لینے کے بعد سارا معاملہ اللہ کے سپرد کرنا)[1] اس تعریف کی رو سے تدبیر و سعی بھی

توکل کا حصہ قرار پاتی ہے۔

قرآن مجید میں متعدد جگہوں پر اہل ایمان کو اسباب کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ جہاں یہ بات کہی گئی ہے کہ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اُس کا گمان بھی نہ جاتا ہو جو اللہ پر بھروسا کرے اس کے لیے وہ کافی ہے اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے۔ سورہ طلاق، آیت ۳) وہیں یہ بھی کہا گیا ہے کہ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ (پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ سورہ جمعہ، آیت ۱۰) اللہ تعالیٰ کی نصرت کا وعدہ کیا گیا لیکن ساتھ میں ہر جگہ کوشش و جدوجہد کا حکم بھی دیا گیا بلکہ جدوجہد کے لیے ممکنہ مادی اسباب و وسائل حاصل کرنے اور انھیں تیار رکھنے کا بھی بہت واضح حکم دیا گیا ہے وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ (اور جہاں تک تمھارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے اُن کے مقابلہ کے لیے مہیا رکھو۔ سورہ انفال، آیت ۶۰) جہاں تک امت کی اجتماعی زندگی کا تعلق ہے، یہ بات قرآن نے بڑی وضاحت کے ساتھ کہہ دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اسی وقت بدلتا ہے جب وہ خود تبدیلی کے لیے کوشش کرے۔ (إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ۔ سورہ رعد، آیت ۱۱)

قرآن مجید میں توکل کے ذکر کے ساتھ کئی جگہ اللہ تعالیٰ کی کچھ خاص صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ مَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (جو اللہ پر بھروسا کرے تو یقیناً اللہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔ سورہ انفال، آیت ۴۹) وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ (اور اُس زبردست اور رحیم پر توکل کرو۔ سورہ شعراء، آیت ۲۱۷) إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ سورہ شعراء، آیت ۲۲۰) یعنی اللہ تعالیٰ کی قوت و طاقت، اُس کا علم، اُس کی رحمت، اُس کی حکمت، توکل ان سب پر ایمان کا تقاضا ہے۔ اللہ پر توکل میں اس کی طاقت و قوت پر اعتماد بھی شامل

ہے اور اس کی رحمت ورأفت پر بھی۔ اس کی مشیت پر اعتماد بھی اس کا حصہ ہے اور اس کی سنت پر اعتماد بھی۔ اللہ کے ارادے پر بھی بھروسا ضروری ہے اور اس کے وعدوں پر بھی۔ اللہ تعالیٰ مسبب ہے، اسباب کا محتاج نہیں ہے لیکن اس عالم اسباب میں وہ قوانین فطرت کے ذریعے اپنی مشیت کی تکمیل کرتا ہے۔ اس لیے اسباب وتدبیر اللہ کی سنت کا حصہ ہیں۔ جب خاص طور پر امت مسلمہ کے اعلیٰ مقاصد اور اس کی منصبی جدوجہد پر ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس راہ میں بہتر سے بہتر تدبیر کو اختیار کرنا دراصل اللہ کی سنت پر اعتماد ہے۔ تدبیر کو اس یقین واعتماد کے ساتھ اختیار کرنا کہ اس سے ضرور اچھا نتیجہ نکلے گا، یہ اللہ کے وعدے پر اعتماد ہے۔ بڑی طاقت اور بڑے مفاد کو خاطر میں لائے بغیر اعتماد اور حوصلے کے ساتھ آگے بڑھنا اور ظاہری قوت وصلاحیت سے بڑھ کر حصول مقصد کی جستجو کرنا، یہ اللہ کی طاقت اور اس کی نصرت پر بھروسا ہے۔ اس راہ میں جو مشکل، آزمائش یا ظاہری ناکامی درپیش ہو، اُسے اللہ کی مرضی مان کر، کسی پوشیدہ خیر کا ذریعہ سمجھ کر، پریشان ہوئے بغیر ثابت قدمی کے ساتھ اُس کا سامنا کرنا اور آگے بڑھنا، یہ اللہ کی رحمت پر اعتماد ہے۔ توکل ان سب کیفیات کا مجموعہ ہے۔ گویا توکل تدبیر وحکمت بھی پیدا کرتا ہے اور حوصلہ واعتماد بھی۔ بڑی کام یابیوں پر عجز بھی پیدا کرتا ہے اور ناکامیوں پر ہمت ہارے بغیر نئی راہیں تلاش کرنے اور استقامت کے ساتھ جہد مسلسل کے داعیے کی افزائش بھی کرتا ہے۔ اس طرح، توکل ایمان باللہ کا ایسا زبردست اور اثر آفریں پھل ہے جو اُن تمام مثبت اور تعمیری نفسیاتی خصوصیات کا سرچشمہ ہے جو کام یابی کی ضامن سمجھی جاتی ہیں۔

قرآن مجید نے اولوالعزم انبیا کے حوالے سے جہاں یہ بات کہی ہے کہ وہ اللہ پر بھرپور اعتماد کرتے تھے وہیں متعدد جگہ یہ اشارے بھی دیے ہیں کہ وہ اسباب اور دنیوی ومادی تدابیر سے بھی غافل نہیں رہتے تھے۔ یعقوب علیہ السلام کے سامنے جب یوسف علیہ السلام نے اپنا خواب بیان کیا تو انھوں نے فوراً کہا یٰبُنَیَّ لَا تَقۡصُصۡ رُءۡیَاكَ عَلَىٰٓ إِخۡوَتِكَ فَیَكِیدُوا لَكَ كَیۡدًا (بیٹا، اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا ورنہ وہ تیرے درپئے آزار ہو جائیں گے۔ سورہ یوسف، آیت ۵) اس

طرح وقت کے پیغمبر نے اپنے بیٹے کو حفاظت کے لیے احتیاطی تدبیر کی تلقین کی۔ جب بعد میں یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے یوسف علیہ السلام کی دعوت پر اپنے بھائی کو ساتھ لے جانے کے لیے اجازت طلب کی تو انھوں نے کہا يَابَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِن بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ وَمَا أُغْنِي عَنكُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ (میرے بچو، مصر کے دارالسلطنت میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا مگر میں اللہ کی مشیت سے تم کو نہیں بچا سکتا، حکم اُس کے سوا کسی کا بھی نہیں چلتا، اسی پر میں نے بھروسا کیا، اور جس کو بھی بھروسا کرنا ہو اسی پر کرے۔ سورہ یوسف، آیت ۶۷) اللہ کے اس برگزیدہ نبی کی اس نصیحت میں توکل کے فلسفے کا خلاصہ موجود ہے۔ پہلے ممکنہ انسانی تدبیر کی طرف اشارہ ہے پھر اللہ پر بھروسے کا اعلان۔ قحط سالی سے بچنے کے لیے یوسف علیہ السلام نے جو پلاننگ کی اور مادّی تدابیر اختیار کیں، قرآن میں اس کی تفصیل بھی موجود ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اپنی جدوجہد کے ہر مرحلے میں بہترین تدبیریں اختیار کیں۔ معاہدے کیے، جنگیں لڑیں، ہجرت کی، ہجرت کو جاتے ہوئے غار میں پناہ لی، حلیف بنائے، شرپسندوں کی سرکوبی کی، غرض یہ کہ اس عالم اسباب میں کام یابی وحصول مقصد کے جو راستے اور تدابیر موجود ہیں، ان سب کو بہترین طریقے سے بروئے کار لائے۔

لیکن یہ بات بھی واضح رہے کہ انبیا علیہم السلام نے ان تدبیروں کو استعمال کرتے ہوئے، صرف تدبیر یا سبب کو سب کچھ نہیں سمجھا، اللہ کے حکم کی تعمیل میں بڑی سے بڑی طاقتوں کا ہمت و دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا، ناکافی اسباب ووسائل کے ساتھ حیرت انگیز مہمات سر کیں، بظاہر ناممکن نظر آنے والے کام انجام دیے، سخت سے سخت آزمائش کا ایسے سامنا کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ دوسرے لفظوں میں انھوں نے اللہ کی سنت پر بھی اعتماد کیا اور اُس کی قدرت اور اس کے وعدوں پر بھی۔ سنت پر اعتماد کا تقاضا ہے کہ بہتر سے بہتر تدبیر اختیار کی جائے اور قدرت اور وعدوں پر اعتماد کا تقاضا ہے کہ مادی تدبیر ہی کو سب کچھ نہ سمجھا جائے۔

اسباب و تدبیر کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ بعض پیغمبروں کو معجزے دیے گئے اور خارق عادت طریقوں سے ان کی مدد کی گئی تو اس میں بھی کسی نہ کسی ظاہری سبب کو ضرور ذریعہ بنایا گیا۔ ایوب علیہ السلام کے علاج کے لیے انھیں پاؤں زمین پر مارنے کا حکم دیا گیا(اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ۔ سورہ ص، آیت ۴۲)۔ نوح علیہ السلام کو طوفان سے بچاؤ کے لیے کشتی بنانے کا حکم دیا گیا(وَاصْنَعِ الْفُلْكَ۔ سورہ ہود، آیت ۳۷)۔ موسیٰ علیہ السلام کے لیے سمندر میں راستہ اس وقت بنا جب انھوں نے اللہ کے حکم سے اپنا عصا مارا(اضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ۔ سورہ شعراء، آیت ۶۳)۔ مریم علیہا السلام کے کھانے کا مسئلہ اس وقت حل ہوا جب انھوں نے پیڑ کے تنے کو ہلایا۔ (وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ۔ سورہ مریم، آیت ۲۵)۔ ان سب مثالوں میں معجزاتی طریقوں سے مدد کی گئی تھی لیکن ان میں کم زور سہی کسی ظاہری سبب کا ذکر دراصل یہ اشارہ ہے کہ اللہ کی مدد اس وقت آئے گی جب بندہ وہ کام کر گزرے جو اس کے بس میں ہے۔

توکل کے اس اسلامی فلسفے کی مزید وضاحت ایک مشہور حدیث سے ہوتی ہے کہ ایک صحابی نے آپ سے دریافت کیا کہ أَعْقِلُهَا وَأَتَوَكَّلُ أَوْ أُطْلِقُهَا وَأَتَوَكَّلُ ؟ قَالَ اعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ (میں[اونٹنی کو] رسی سے باندھوں پھر توکل کروں یا اسے یونہی چھوڑ دوں اور توکل کروں؟ آپ نے جواب دیا کہ رسی سے باندھو پھر توکل کرو)۔[۲]

اس بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ توکل دراصل مندرجہ ذیل چار رویوں کے مجموعے کا نام ہے۔

جو معاملہ بھی درپیش ہو، اس میں اپنے مطلوب و مقصود کو حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کرنا اور سارے ممکنہ وسائل کو بروئے کار لانا اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرنا۔

کوشش کرتے ہوئے اللہ کی طاقت پر اور اس کے وعدوں پر بھرپور اعتماد کرنا، اس کی پشت پناہی اور نتیجتاً اپنی قوت وصلاحیت میں بے پناہ اضافہ محسوس کرنا اور خدا اعتمادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بھرپور خود اعتمادی کے ساتھ اپنے کاموں کو انجام دینا۔

اپنے بس میں جو کچھ ہے وہ کر گزرنے کے بعد اللہ سے بہتر امید رکھنا اور یہ یقین رکھنا کہ

اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ اچھا معاملہ کرے گا۔

اگر توقع کے مطابق اچھا نتیجہ ظاہر ہو تو اللہ کا شکر ادا کرنا اور اگر توقع کے خلاف نتیجہ نکلے تب بھی یہ یقین رکھنا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کیا ہے اس میں اس کی کوئی مصلحت ہوگی اور اس میں بھی ہمارے لیے خیر ہی ہوگا اور اس کی مرضی پر راضی رہنا۔ (البتہ ان غلطیوں اور کمیوں کا ضرور احتساب کرنا جو جدوجہد کرنے اور تدبیر کو اختیار کرنے میں سرزد ہوئیں) اور کوشش کے بعد جو باتیں ہماری کوشش کے دائرے کے باہر ہیں انھیں اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے چھوڑ دینا۔

ہم جب کسی قابل ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں تو پورے اطمینان سے خود کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ نامعلوم کڑوی دوائیں کھلاتا ہے۔ تکلیف دہ انجکشن لگاتا ہے، کبھی (آپریشن کے لیے) پیٹ چیر دیتا ہے، کھوپڑی پھوڑ دیتا ہے، لیکن ہمیں اعتماد ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے، ہمارے فائدے کے لیے کر رہا ہے۔ بعض اذیت ناک طریقہ ہائے علاج کے مصالح ہماری سمجھ سے باہر ہوتے ہیں لیکن ہمیں اُس کی شخصیت اور اس کے علم پر بھروسا ہوتا ہے۔ ہم اپنے جہل کو بھی جانتے ہیں اور اس کے علم سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ اس لیے وقتی اذیت کو بھی ہم بخوشی قبول کر لیتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اذیت کا سبب ہماری سمجھ سے باہر ہو تب بھی جب یہ قابل ڈاکٹر اذیت دے رہا ہے تو کچھ فائدہ ضرور ہوگا۔ اس تکلیف کا ہماری صحت یابی میں کوئی ممکنہ رول لازماً ہوگا۔

اللہ تعالیٰ پر ہمارا اس سے کہیں زیادہ اعتماد ہونا چاہیے۔ آنے والی مصیبتوں اور مشکلات کے سلسلے میں بھی یہ یقین ہونا چاہیے کہ اگر ہم نے کوشش کا حق ادا کر دیا تو ان شاء اللہ یہ مشکلات بھی ہمارے لیے بالآخر کام یابی کے راستے کھولنے کا ذریعہ بنیں گی۔ ظفر علی خان مرحوم نے اپنے ایک شعر میں توکل کا خلاصہ بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے:

توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا
نتیجہ اس کی تیزی کا مقدر کے حوالے کر

اس طرح توکل کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ ہم کر سکتے ہیں، جو کچھ ہمارے بس میں ہے وہ

آخری حد تک ہم کر گزریں اور جو ہمارے بس میں نہیں ہے اس میں بھی بے بسی کا کوئی احساس نہ آنے دیں، بلکہ اپنی ذمہ داری ادا کرنے کے بعد عزم ویقین اور اطمینان سے دل ودماغ لبریز رہے۔ فکرمندی اور بے اطمینانی اسی وقت تک ہو جب تک ہم اپنی تدبیر اور کوشش کا حق ادا نہیں کر رہے ہیں جب اپنے حصے کا کام کرلیا تو پھر اللہ کافی ہے اور اس کی مرضی پر ہم راضی اور مطمئن ہیں۔

توکل اور اجتماعی رویہ پر اس کا اثر

توکل اور توکل کی یہ اسپرٹ انسانوں اور انسانی جماعتوں کو بہت سی اُن کم زوریوں سے نجات دلاتی ہے جو کام یابی و سربلندی کی راہ میں رکاوٹ اور پیروں کی بیڑیاں بنتی ہیں۔

❶ تدبیر، اسباب اور جدوجہد: ناکامیوں کا ایک بڑا سبب تدبیر، اسباب اور جدوجہد سے گریز ہے۔ توکل ان سے گریز کا نہیں بلکہ ان کو بھرپور طور پر اختیار کرنے کا سبق سکھاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ اسباب کے ذریعے ہی عام طور پر اپنی مشیت پوری کرتا ہے۔ جیسا کہ واضح کیا گیا، اللہ پر توکل کے مطلب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اُس کی اِس سنت کا احترام کیا جائے۔ اسباب کو اختیار کرنا اور ممکنہ تدابیر کرنا، یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اس لیے اللہ پر اعتماد کا تقاضا ہے کہ اس حکم کی تعمیل کی جائے اور بھرپور طریقے سے کی جائے۔ یہ اللہ کی سنت پر اعتماد ہے۔ معاملہ چاہے، انفرادی زندگی کا ہو یا اجتماعی معاملات کا، پہلے تدبیر اور کوشش، پھر اللہ سے استعانت اور معاملے کو اس کے حوالے کرنا، یہی مومنانہ شیوہ ہے۔ ایک طالب علم پہلے بھرپور پڑھائی کرے، اس کے بعد نتیجے کو اللہ پر چھوڑے۔ ایک مریض علاج کی ممکنہ کوشش کرے پھر اللہ کے فیصلے کو خوشی سے قبول کرلے۔ پہلے روزی کی تلاش کی ممکنہ جستجو کی جائے پھر رازق حقیقی، جو کچھ عطا کرے اُس پر اطمینان و استغنا کا نمونہ بن جائے۔ اجتماعی زندگی میں بھی، یہ نہیں ہوسکتا کہ مسلمان حسن تدبیر اور جہد و عمل سے غافل رہیں اور اللہ سے مدد و نصرت کی توقع رکھیں۔ یہ ضروری ہے کہ وہ بہترین حکمت عملی بنائیں، اعلی درجے کی صلاحیتوں کی اپنے درمیان افزائش کریں، اپنی کم زوری اور درماندگی کے حقیقی اسباب کی کھوج کریں اور اُن اسباب پر قابو پائیں، بہترین عصری

صلاحیتوں کی حامل قیادتوں کو ابھاریں، اچھے سے اچھے اسباب ووسائل کے حصول کی ممکنہ کوشش کریں اور اُن کو بہترین طریقے سے استعمال میں لائیں، جدوجہد اور قربانی کا حق ادا کریں، مطالعہ و تحقیق، منصوبہ بندی، انتظام وقیادت کے جدید ترین طریقوں کو روبہ کار لائیں۔ اس عالم اسباب میں کام یابی کے یہی راستے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو کام یابی کی ان معروف علتوں سے مستثنیٰ نہیں کرتا۔ اللہ کے محبوب ترین رسول کو بھی ان راستوں کو اختیار کرنا تھا۔ ان اسباب کو اختیار کرنا ہی اس دور میں اونٹ کو رسی سے باندھنا ہے، جو توکل کا جز ہے۔

❷ فیصلہ، ارادہ اور خطروں سے پنجہ آزمائی: کسی بھی میدان میں کام یابی کے لیے بروقت فیصلے کرنے کی صلاحیت نہایت ضروری ہوتی ہے۔ ایک چھوٹے سے فیصلے میں دیر کبھی کام یابی کی منزل کو کوسوں دور کر دیتی ہے۔ توکل کی صفت، آدمی کو قوت فیصلہ سے مالا مال کرتی ہے۔ تذبذب، اوہام اور اندیشوں کا شکار رہنا، توکل کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ توکل یہ ہے کہ آدمی غور و فکر کرے، مشورہ کرے اور اس کے بعد ایک رائے پر پہنچ کر، اللہ پر بھروسا کرے اور قدم آگے بڑھائے۔ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ (پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسا کرو)۔ رسول اللہ ﷺ نے استخارہ کا عمل سکھایا ہے۔ مشکل فیصلے کرنے کا یہ نہایت عمدہ متوکلانہ طریقہ ہے، جس میں آدمی غور و فکر کرتا ہے۔ پھر معاملہ کو اللہ کے سپرد کر کے، اس سے خیر طلب کر کے، کسی فیصلہ پر یکسو ہو جاتا ہے اور پوری دل جمعی کے ساتھ اس کے نفاذ میں لگ جاتا ہے۔ بڑے فیصلوں کے ساتھ بڑے جوکھم (رسک) وابستہ ہوتے ہیں۔ اجتماعی زندگی میں یہ جوکھم فیصلہ کرنے والوں کے لیے ذاتی مشکلات، آزمائشوں اور مصائب سے متعلق بھی ہو سکتے ہیں اور خود پوری جماعت یا ملت کے لیے لاحق اندیشوں سے متعلق بھی ہو سکتے ہیں۔ بڑی کام یابیاں ہمیشہ بڑے رسک کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ توکل کی صفت رسک لینے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ رسک لینا، دراصل اللہ کی مدد و نصرت پر، لنهدينهم سبلنا پر، اور اس کی رحمت پر اعتماد کا نتیجہ ہوتا ہے، ویسے ہی جیسے ایک چھوٹا بچہ اپنے والد کو پیچھے کھڑا دیکھ کر پر خطر راستے پر بے خوف آگے بڑھتا ہے۔

❸ نتائج پر نظر، الزامات پر نہیں (outcome frame, not blame frame):
ان دنوں یہ لیڈرشپ ٹریننگ کا ایک اہم موضوع ہے۔ ناکامیوں کا ایک بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ ہمارا ذہن مسائل اور مشکلات ہی میں الجھا رہتا ہے۔ مسئلہ کیوں پیش آیا؟ اس کے لیے کون ذمہ دار ہے؟ اس کو کیا سزا ملنی چاہیے؟ ان سوالات پر ذہنوں کا صد فی صد ارتکاز اپنے مقصود پر نظریں جمانے، آگے کی راہیں دیکھنے اور ان پر چلنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ہمارا زیادہ ارتکاز اس پر ہونا چاہیے کہ ہمیں کیا حاصل کرنا ہے (outcome) اور اس کے لیے اس وقت کیا کرنے کی ضرورت ہے؟ توکل، آوٹ کم فریم (outcome frame) پیدا کرتا ہے۔ جو کچھ ہو گیا، وہ اب ہماری تدبیر اور کوشش کے دائرے سے نکل گیا۔ جو کچھ دوسرے کر رہے ہیں، وہ بھی ہمارے دائرہ عمل سے پرے ہے۔ اس لیے یہ سب اللہ کے حوالے ہے۔ ہمیں بس یہ دیکھنا ہے کہ ان حالات میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہمارے لیے عمل کی دنیا میں کیا متبادل بچے ہیں؟ کیا تدبیر، کیا قدم، کیا فیصلہ اور کیا عمل ہمارے دائرہ امکان میں باقی ہے؟ ابھی کون سی وہ رسّی ہماری دسترس میں ہے، جسے ہم باندھ کر معاملے کو اللہ کے حوالے کر سکتے ہیں؟

❹ دائرہ اثر میں ارتکاز، دائرہ تعلق میں نہیں (circle of influence, not circle of concern): اسی سے ملتی جلتی تھیوری مشہور لیڈرشپ کوچ اسٹیفن کوئے نے پیش کی ہے[۳] کہ کام یاب ترین لوگوں کی ایک صفت یہ ہوتی ہے کہ اُن کا ارتکاز اُن باتوں پر ہوتا ہے جو وہ کر سکتے ہیں یا جن پر وہ اثر ڈال سکتے ہیں۔ وہ اثر کا دائرہ بڑھانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن ان باتوں سے بہت زیادہ تعرض نہیں کرتے جو ان کے دائرہ اثر سے پرے ہوں۔ جب کہ ناکام لوگ زیادہ تر اُن امور میں اپنا ذہن اور وقت لگاتے ہیں جو اُن کے کنٹرول سے باہر ہوتے ہیں۔ جن پر وہ کوئی اثر نہیں ڈال سکتے، محض اپنی دل چسپی کا یا تشویش کا اظہار کر سکتے ہیں۔ کام یابی کے لیے ضروری ہے کہ ہماری محدود قوت و توانائی اُن کاموں میں لگے جن کے سلسلہ میں ہم کوئی تبدیلی لا سکتے ہیں یا نتیجہ پیدا کر سکتے ہیں۔

یہ عین توکل کا فلسفہ ہی ہے۔ توکل بھی یہی سکھاتا ہے کہ جو باتیں آپ کے دائرہ اختیار سے پرے ہیں، جن کے سلسلے میں کوئی تدبیر آپ نہیں کر سکتے، کوئی سبب یا وسیلہ اختیار نہیں کر سکتے، وہ اللہ کا دائرہ ہے، اُس پر بھروسا کیجیے، اس سے دعا مانگیے، استعانت کیجیے، اور اُنھیں اللہ پر چھوڑ دیجیے۔ ان کے سلسلے میں غیر متوازن فکر مندی اور اپنی ذہنی و عملی توانائیوں کو اس پر لگانے کا کوئی محل نہیں ہے اور جہاں آپ کچھ کر سکتے ہیں وہاں کر گزرنے پر توجہ دیجیے کہ وہ آپ کا دائرہ ہے۔ اسی میں آپ کو رسی باندھنے کا حکم ہے۔

مشاہدہ یہی بتاتا ہے کہ ناکام گروہوں اور قوموں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ اُن کی زیادہ توجہ بیرونی مسائل اور مشکلات پر ہوتی ہے۔ وہ رات دن اُن کا رونا روتے رہتے ہیں اور بیرونی مسائل کی وجہ سے اپنے لیے کام یابی و کامرانی کو ناممکن سمجھتے ہیں۔ صبح و شام وہ دشمنوں کی ریشہ دوانیوں اور حقیقی و غیر حقیقی سازشوں کا ماتم کرتے رہتے ہیں۔ جب کہ کام یاب افراد کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان کی نظر اپنے مقصود پر ٹکی ہوتی ہے۔ جو کچھ ان کے بس میں ہے اور ممکن ہے، اسے کر گزرنے پر ان کی زیادہ توجہ ہوتی ہے۔ جو امور ان کے دائرہ امکان سے پرے ہیں، ان پر وہ زیادہ دھیان نہیں دیتے۔ توکل یہی اسپرٹ پیدا کرتا ہے۔ امکان کی آخری حد تک کوشش کرنا اور جو امور ہمارے دائرہ اختیار سے باہر ہوں، ان کو اللہ کے حوالہ کر دینا یہی توکل ہے۔ یہ سوچ کا ایک بالکل مختلف پیراڈائم ہے۔ یہ پیراڈائم افراد اور گروہوں کو عملیت پسند اور رجائیت پسند بناتا ہے۔

5 ماضی کے نوحے اور مستقبل کے اندیشوں سے زیادہ حال کے عمل پر توجہ: افراد اور قومیں جب ضرورت سے زیادہ ماضی پرست ہو جاتی ہیں تو حال کی ڈوری ان سے چھوٹ جاتی ہے۔ ماضی کی خوش گوار یادوں (پدرم سلطان بود) کا سحر یا ناگوار یادوں کی اذیت انھیں آج کے مسائل اور آج کے امکانات کی طرف آنے ہی نہیں دیتی۔ جو کچھ ہو گیا اس پر اب ہمارا بس نہیں ہے۔ اس کے نتائج اب اللہ کے حوالے ہیں۔ اگر ہماری غلطیوں کی وجہ سے کچھ خراب ہو گیا ہے تو ہمارے پاس توبہ کا اور تلافی کا راستہ ہے جس کا تعلق آج کے عمل سے ہے۔ اسی طرح مستقبل کے حوالے سے طرح

طرح کے اندیشوں میں گرفتار لوگ بھی ناکام لوگ ہوتے ہیں۔ آدمی کے ذہن پر حادثہ کا خوف سوار ہو جائے تو وہ زندگی میں کسی سفر کے لائق نہیں رہتا۔ ماضی پر ارتکاز ذہنی تناؤ (depression) پیدا کر سکتا ہے اور مستقبل پر ارتکاز اضطراب (anxiety)۔ دونوں نفسیاتی امراض ہیں۔ یہ امراض جس طرح افراد کو لاحق ہوتے ہیں اسی طرح جماعتوں کو بھی لاحق ہو سکتے ہیں۔ مستقبل میں کیا ہوگا، یہ اللہ ہی کو معلوم ہے۔ ہمارا کام آج بہتر سے بہتر عمل کرنا ہے۔

وہ قوم نہیں لائق ہنگامہ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

توکل یہ ہے کہ ہمارا عمل بہتر ہوگا تو ان شاء اللہ مستقبل بھی بہتر ہوگا۔ ہمیں گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو ہوگا وہ اللہ کے وعدے اور اس کی سنت کے مطابق ہوگا۔ اس لیے مطلوب رویہ یہ ہے کہ ہماری توجہات حال پر اور آج کیے جانے والے کاموں پر ہوں۔ ماضی سے ہم درس لیں، مستقبل کو سامنے رکھ کر منصوبہ بندی کریں۔ لیکن اصل محنت و جستجو حال میں ہونی ہے۔ اس لیے سب سے زیادہ توجہ آج پر اور آج کے اُن مطلوب کاموں پر ہو جن کے ذریعے مستقبل بہتر ہو سکتا ہے اور ماضی کے نقصانات کی تلافی ہو سکتی ہے۔

6 ممکنات پر ارتکاز، عملیت پسندی اور نفسیاتی طمانیت: توکل انسان کو ہر حال میں نفسیاتی لحاظ سے مستحکم و مطمئن رکھتا ہے۔ یہ کبھی مایوس ہونے نہیں دیتا۔ جذبات کو کنٹرول میں رکھتا ہے۔ بڑے سے بڑے حادثے میں بھی آدمی کو اور گروہوں یا قوموں کو ٹوٹنے نہیں دیتا۔ ایک راستہ بند ہو جائے تو توکّل کرنے والا آدمی، اس کا ماتم کرتے نہیں بیٹھتا بلکہ دوسرے راستے تلاش کر لیتا ہے۔

بے عمل دانش وری، تبدیلی کے کسی تصور کے بغیر شکایتی و ماتمی تجزیہ نگاری، اور ٹھوس تدبیروں کے بغیر شیخ چلی کے خواب، یہ سب رویے توکل کے فلسفے سے ٹکراتے ہیں۔ توکل عملیت پسندی اور حقیقت پسندی کا مزاج پیدا کرتا ہے، ممکنات (possibilities) پر ارتکاز

عطا کرتا ہے۔ یہ دیکھا جائے کہ ہمارے لیے کیا کرنا ممکن ہے؟ ممکنات کے دائرے کو بڑا کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہر ممکن تدبیر اختیار کی جائے، ہر ممکن وسیلہ استعمال کیا جائے، ہر ممکن قدم اٹھایا جائے۔ اس لیے کہ اسباب کو بھرپور طریقے سے استعمال کرنا توکل کی پہلی شرط ہے۔ اور جو ممکنات سے پرے ہے، اس پر توانائی نہ لگائی جائے، اس پر کسی پریشانی کے ہم شکار نہ ہوں، اور وہ رات دن لاحاصل گفتگو کا موضوع نہ بنے۔ اس لیے کہ جس معاملہ میں کوئی تدبیر ہمارے لیے ممکن نہ ہو، وہ اللہ کے حوالے ہے۔ اپنا کام آخری حد تک کیا جائے اور پھر اللہ پر بھروسا رکھا جائے۔ یہی توکل ہے اور یہی توکل کی اسپرٹ ہے۔

7 مقصد و نصب العین اور اصولوں پر استقامت: اس موضوع کو اس سلسلۂ مضامین میں ہم مسلسل زیر بحث لارہے ہیں۔ توکل ہمیں اپنے مقصد و نصب العین اور اپنے اصولوں پر استقامت کے ساتھ جمے رہنے میں مدد دیتا ہے۔ ہمارے اصول اور ہمارے مقاصد، یہ اللہ کے احکام ہیں، اس پر اعتماد کا تقاضا ہے کہ ہر حال میں ہم ان پر قائم رہیں، اور جو کچھ ہم سے ان مقاصد کے حصول کے لیے ممکن ہے وہ کرتے رہیں۔ اوپر نبیوں کے حوالے آچکے ہیں کہ وہ اپنے کاموں پر استقامت کے ساتھ جمے رہے اور یہی کہا کہ ہم اپنا کام کرتے رہیں گے اور مخالف قوتیں چاہے جو کریں، ہم اللہ پر توکل کرتے ہوئے اس کی کوئی فکر نہیں کریں گے۔ اللہ کے دین کی دعوت اور اللہ نے جس کام کو فرض کیا ہے اس کی ادائیگی کے معاملے میں صرف مادی تدابیر اور قوانین فطرت ہی پر انحصار کافی نہیں ہے، بلکہ اللہ کی مدد و نصرت کو شامل حال کرنا بھی ضروری ہے۔ ہم اپنی کوشش کا حق ادا کریں گے تو نتیجہ، اللہ کی مدد سے، ہماری کوشش اور اسباب کی ظاہری طاقت و صلاحیت سے کہیں بڑھ کر نکلے گا۔ یہ اعتماد ہی توکل ہے۔ توکل نہ ہو تو آدمی اپنے اصولوں کے سلسلے میں کم زوری اور مداہنت کا رویہ اختیار کرنے لگتا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی توکل کی کمی کی علامت ہے کہ اپنے اعلیٰ مقصد کی طرف آگے بڑھنے کے لیے جلد بازی میں آدمی غیر اصولی انتہاپسندی کا شکار ہو جائے۔ نبی کریم ﷺ سے بھی یہی کہا گیا

کہ آپ کا کام انذار و تبشیر ہے، وہ کام کرتے رہیں۔ باقی گناہ گاروں سے نبٹنے کے لیے اللہ موجود ہے، اس پر توکل کریں۔ (سورہ فرقان، آیت ۵۸)

توکل پر مبنی حکمت عملی

اوپر اجتماعی رویے کے ذیل میں جو سات باتیں بیان کی گئی ہیں، ہمارا اجتماعی رویہ اکثر ان کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ تدبیر، حکمت عملی اور وسائل کی کوشش ہم بہت کم کرتے ہیں۔ آج کے اس دور میں کام یابی کا انحصار جن باتوں پر سمجھا جاتا ہے، اُن کی فکر ہمارے درمیان بہت کم ہے۔ اعلیٰ درجہ کی صلاحیتوں کی افزائش، ان کی قدر دانی اور استعمال کا سلیقہ مفقود ہے۔ علمی اداروں اور تھنک ٹینک کا رواج اور ٹھوس علم و تحقیق کی بنیادوں پر فیصلے کرنے کا کلچر نہایت کم زور ہے۔ قیادت و انتظام، منصوبہ بندی و نفاذ کے ترقی یافتہ طریقے معدوم ہیں۔ حالاں کہ یہ سب تدبیر کا حصہ ہیں اور اس لیے توکل کا تقاضا ہیں۔ دوسری طرف ایک دوسرے پر تنقیدوں میں، اپنے خلاف ہو رہی سازشوں کے تذکروں میں، اور ہر اُس بات کو اپنے حواس پر طاری کر لینے میں ہم پیش پیش ہیں جن پر ہمارا نہ بس ہے اور نہ جن کا کوئی تعلق ہمارے عمل و اقدام سے ہے۔ جدید دانش وروں کی بڑی تعداد علمائے کرام سے شاکی نظر آتی ہے اور بہت سے علماء جدید دانش وروں کو تمام مسائل کا ذمہ دار مانتے ہیں۔ بزرگوں سے ملیں تو ان میں سے اکثر کو خرابی کی جڑ نوجوانوں میں نظر آئے گی اور نوجوانوں کی اکثریت کو بزرگوں میں۔ الا ماشاء اللہ۔ حالاں کہ توکل ہم کو اپنے عمل کا مکلف کا بناتا ہے۔ دوسروں پر ہم اثر انداز ہو سکتے ہوں تو ضرور ہوں ورنہ اصلاً اپنے کام پر توجہات کو مرکوز کریں۔ اگر ہم ملت اسلامیہ کے قائدین کے بیانات، ہماری صحافت کے تجزیے اور سب سے بڑھ کر سوشل میڈیا پر اپنے نوجوانوں کی تحریروں کا جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ پوری ملت الزامی چوکھٹے (blame frame) میں سوچ رہی ہے اور زندگی گزار رہی ہے۔ مطلوب اہداف و نتائج کا دور دور تک پتہ نہیں ہے۔ ہمارے اجتماعی قویٰ کا عظیم حصہ فکرمندی کے دائرے (circle of concern) میں لگ رہا ہے، اثراندازی کے دائرے (circle of influence) میں نہیں۔ آپ کوئی بھی اردو اخبار اٹھا لیجیے اور اُس کے تجزیوں پر نظر ڈالیے۔ اُمت کی زبوں حالی کا ماتم، مشکلات و مسائل کے نوحے، فلاں فلاں کی ریشہ دوانیوں اور شرارتوں کے تذکرے، سازشوں کے نظریات، اردو لفظیات کی مکمل قوت استعمال

کرتے ہوئے آنے والے بھیانک مستقبل کی بھرپور مبالغے کے ساتھ منظر کشی، یہ سب آپ کو ہر صفحے پر ملے گا لیکن آج کیا کرنا چاہیے؟ ہمارا اگلا عمل یا قدم کیا ہونا چاہیے؟ (جسے جدید اصطلاح میں action item کہا جاتا ہے)، مضامین و تجزیوں کے دسیوں صفحات میں اور فیس بک کی سیکڑوں پروفائلوں میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملے گا۔ ہمارے صحافی، دانش ور، قائدین حتی کہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ نوجوان بھی ایکشن آئٹم کی سوچ سے خالی نظر آتے ہیں۔ لمبے لمبے تجزیوں اور طویل بحثوں کے بعد ہر ایک کی تان اسی پر ٹوٹتی ہے کہ کوئی لائحہ عمل بننا چاہیے۔ کوئی اسٹریٹجی تشکیل پانی چاہیے۔ حالاں کہ ہمارا اصل کام یہی ہے۔ ماضی ہمارا ڈومین نہیں ہے۔ دوسری قوتوں کی کارستانیاں بھی ہمارا ڈومین نہیں ہیں۔ ہمارا ڈومین تو ہمارا کام، ہماری تدبیر، ہمارا اقدام ہے۔ ہماری قوتیں اسی پر لگنی چاہئیں کہ یہ کیا ہو؟

بے شک شر پسندوں کی شر انگیزیوں سے باخبر رہنا بھی ضروری ہے۔ ماضی کی غلطیوں کے احتساب کی بھی اہمیت ہے۔ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے، اس کو جانے بغیر ہم صحیح قدم نہیں اٹھا سکتے۔ ان سب کے سلسلے میں بیدار رہنا ضروری ہے۔ ان بحثوں کا علمی و صحافتی تناظر بھی یقیناً مسلم ہے۔ لیکن باشعور و بامقصد گروہوں کے لیے ان سب کا حتمی مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ ان کے ذریعے اگلا قدم طے کیا جائے۔ ماضی کا ذکر ضرور ہو، دوسروں کی سازشوں کا حوالہ بھی حسب ضرورت ہو، حالات کا تجزیہ بھی ہو، لیکن مقصد بس یہ ہو کہ وہ تدبیر اور وہ ایکشن آئٹم ڈھونڈے جائیں جنھیں کرنا ہمارے لیے ممکن ہو۔ یہ نہ ہو اور صرف نوحہ و ماتم اور خوف و مایوسی کے اظہار پر بات ختم ہو جائے تو کیا یہ رویہ توکل کی اسپرٹ کے خلاف نہیں ہوگا؟

اس سے ہمارے ذہنی سانچے کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک ذہنی سانچہ وہ ہے جس کے اعصاب پر یہ سوال غالب ہوتا ہے کہ ہائے یہ کیا ہو گیا؟ یہ ماضی کی تلخیوں کا مارا ایک شکست خوردہ ذہن ہے۔ ایک اور ذہنی سانچہ وہ ہوتا ہے جس کے اعصاب پر غالب سوال یہ ہوتا ہے کہ کل نہ جانے کیا ہوگا؟ ایسا ہوا تو کیا ہوگا اور ویسا ہوا تو کیا ہوگا؟ یہ مستقبل کے اندیشوں کا شکار ڈرپوک ذہن ہے۔ یہ دونوں ذہنی سانچے ناکامی پر منتج ہوتے ہیں۔ دونوں توکل کی اسپرٹ کے خلاف ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ذہنی سانچے ہماری ناکامی اور ہمارے مسائل کے لیے ذمہ دار عوامل میں سے اہم عامل ہیں۔ جب کہ تیسرا ذہنی سانچہ مومنانہ و متوکلانہ ذہنی سانچہ ہوتا ہے۔ وہ ماضی اور مستقبل کو اللہ کے حوالے کرتا ہے۔ جو

کچھ بس میں نہیں ہے اسے بھی اللہ کے حوالے کرتا ہے اور اس کے اعصاب پر جو سوالات حاوی ہوتے ہیں وہ یہ ہوتے ہیں: مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ان حالات میں میرے پاس کیا راستے ہیں؟ منزل سے قریب تر ہونے کے لیے اب کیا کرنا ممکن ہے؟ حالات کو بہتر بنانے کے لیے میرے پاس کیا طریقے موجود ہیں؟ یہ عملیت پسند ذہنی سانچہ توکل کا نتیجہ ہوتا ہے اور کام یابی کی ضمانت بنتا ہے۔

امت کے افراد کی اس طرح تربیت ہو اور وہ توکل کی صفت سے آراستہ ہوں، یہ ہماری اس وقت ایک بڑی ضرورت ہے۔

(زندگی نو، نومبر ۲۰۲۰)

حواشی و حوالہ جات

۱ بحوالہ شرح صحیح البخاری لابن بطال، مکتبۃ الرشد، الریاض، جلد۹، ص ٤٠٨

۲ سنن الترمذی، حدیث نمبر ۲۵۱۷، رواہ انس بن مالک، حسنہ الالبانی

۳ Covey Stephen R. (2013) Seven Habits of Highly Effective People, Simon and Schuster, New York.

رائے عامہ اور اس کی ہمواری

رائے عامہ کی تشکیل

ملک عزیز میں اقامت دین کے نصب العین کی سمت پیش رفت کے لیے اولین ضرورت یہ ہے کہ یہاں کی رائے عامہ (public opinion) اسلام کے حق میں بدلے۔ جماعت اسلامی ہند کے دستور میں، جماعت کے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

> جماعت اپنے نصب العین کے حصول کے لیے تعمیری اور پر امن طریقے اختیار کرے گی۔ یعنی وہ تبلیغ و تلقین اور اشاعتِ افکار کے ذریعے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کرے گی اور اس طرح ملک کی اجتماعی زندگی میں مطلوبہ صالح انقلاب لانے کے لیے رائے عامہ کی تربیت کرے گی۔[1]

اقامت دین کی منزل کی سمت آگے بڑھنے کے لیے اس وقت فوری ضرورت اگر کسی کام کی ہے تو وہ یہی ہے۔ یہی اگلا فوری ہدف اور سنگِ میل ہے۔ اس مرحلہ سے گزر کر ہی یہ سفر آگے بڑھ سکتا ہے۔ مسلمانوں کا حتمی نصب العین اقامتِ دین ہے، یعنی اللہ کا دین قائم ہو جائے۔ اس نصب العین کی سمت اگر اہم ترین قریب الحصول مقصد (interim goal) کی ایک جملہ میں ترجمانی ہو سکتی ہے تو وہ بس یہ ہے کہ یہاں کی رائے عامہ اسلام کے حق میں بدلے۔ اس ملک کی آبادی دین حق سے واقف ہو۔ اسلام کے عقائد، قدریں اور اصول، اس کا مطمح نظر اور ورلڈ ویو، اسلامی طرز زندگی کی خصوصیات، ان سب سے لوگ متعارف ہوں، اُن سے متاثر ہوں اور ان کے تعلق سے مثبت سوچ اُن کے اندر پیدا ہو۔

مولانا صدر الدین اصلاحیؒ فرماتے ہیں:

> ملک میں غیر مسلم اکثریت کی موجودگی کے اہم اور بنیادی تقاضے دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ

اسے دہرے احساس فرض کے ساتھ دعوت پہنچائی جائے دوسرا یہ کہ اس کے معقول قسم کے شکوک کا ازالہ کیا جائے اور اسے بدگمانیوں میں مبتلا ہونے نہ دیا جائے۔ دہرے احساس فرض کے ساتھ دعوت دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کام کی انجام دہی کو ایک لازمی فریضہ بھی یقین کیا جائے اور تحریک کی ایک لازمی ضرورت بھی سمجھا جائے—تحریک کی لازمی ضرورت اس کام کو اس لیے سمجھا جائے کہ اس تحریک کا واقعی معنوں میں تحریک بن جانا اور اس کی کام یابی کے آثار کا پیدا ہو جانا، بظاہر حالات، اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس غیر مسلم اکثریت میں سے بھی اسے اعوان و انصار ملیں اور ملتے جائیں۔ کیوں کہ غیر مسلم اکثریت کوئی معمولی قسم کی اکثریت نہیں ہے، بلکہ ستاسی اٹھاسی فی صد کی تعداد رکھنے والی غیر معمولی اکثریت ہے۔ پھر کئی پہلوؤں سے یہاں کی اصل کارفرما قوت بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔[۲]

اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہماری کوششیں اور محنتیں اس ہدف پر مرکوز ہو جائیں۔ ہمارے ہر کام کا نتیجہ یہ نکلے کہ ملک کی رائے عامہ مثبت رخ پر بدلے۔

ملک کی آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی سرگرمیوں اور اجتماعی جدوجہد میں، اس کام کو وہ مقام نہیں مل سکا جس کا وہ متقاضی تھا۔ مسلمانوں نے اپنے دینی و تہذیبی تشخص اور شعائر کی حفاظت کی کوشش کی، دینی بیداری اور اصلاح معاشرہ کے لیے کوشاں رہے اور سیاسی، معاشی اور عام شہری حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ یہ سب کام یقیناً اہم تھے اور آج بھی اہم اور ضروری ہیں۔ لیکن ہندوستان جیسے مخلوط سماج میں سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم اس ملک کی اکثریت سے بات کرتے، ملک کی رائے عامہ کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے اور اِس کی اسلامی تعلیمات کے متعلق تعمیر و تشکیل کی کوشش کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ اہم ترین کام بہت کم ہماری اجتماعی کوششوں کا ہدف بن پایا ہے۔

اس کا نتیجہ ہے کہ گذشتہ ستر برسوں میں اسلام کے حوالے سے ملک کی رائے عامہ میں اگر کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے تو وہ زیادہ تر منفی رخ پر ہے۔ ایک طرف صورت حال یہ ہے کہ آج مسلمان پہلے سے زیادہ اسلام اور اسلامی شعائر سے قریب ہیں۔ دین کا علم عام ہوا ہے۔ دین

کے نام پر بدعات و خرافات اور جہالت کم ہوئی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی آج دینی جدوجہد میں پیش پیش ہے۔ لیکن دوسری طرف جہاں تک ملک کی رائے عامہ کا تعلق ہے، وہ پہلے سے زیادہ اسلام کے تعلق سے غلط فہمیوں کی شکار ہے۔ اسلام کے تئیں نفرت و توحش میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ اسلام اور اہل اسلام کے سلسلہ میں مثبت جذبات پہلے سے کم اور منفی جذبات زیادہ ہیں۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس صورت حال کے لیے ملکی اور عالمی سیاست ذمہ دار ہے یا اسلام مخالف طاقتوں کی کارستانیاں ذمہ دار ہیں۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس صورت حال کے لیے ہماری کم زوری اور حکمت عملی کا نقص بھی ذمہ دار ہے۔ اسلام مخالف طاقتیں تو مسلمانوں کو بھی اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرتی رہی ہیں۔ مسلم معاشرہ بھی لبرل خیالات کی چوطرفہ یورش کی زد میں رہا ہے۔ نظام تعلیم نے مسلمان نوجوانوں کو بھی غیر اسلامی طرز فکر کا عادی بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود اگر صورت حال بہتر ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مصلحین کی کوششوں کا یہ ایک اہم ہدف تھا کہ مسلمانوں میں دینی بیداری آئے اور مسلمان اسلام سے وابستہ ہوجائیں۔ اگر اسی طرح کی اجتماعی کوششیں ملک کی عام آبادی سے بات چیت، ڈائیلاگ اور رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کے لیے کی جاتیں تو اس محاذ پر بھی ضرور پیش رفت ہوتی۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ رائے عامہ کی تبدیلی، اہل اسلام کا اہم ترین اقدامی ایجنڈا بھی ہے اور دفاعی ایجنڈا بھی۔ اقدامی، اس لیے کہ مسلمان کی اصل حیثیت داعی الی اللہ کی ہے اور رائے عامہ کی اسلام کے رخ پر تبدیلی داعی الی اللہ کا ایک اہم ہدف ہوتا ہے۔ دفاعی اس لیے کہ اس وقت اسلام دشمن طاقتوں کا بنیادی ایجنڈا، اسلام کو بدنام کرنا اور اس کے تعلق سے غلط فہمیاں اور تنفر پیدا کرنا ہے۔ دنیا بھر میں اور ہمارے ملک میں بھی، اہل اسلام کے ساتھ جو شرارتیں ہورہی ہیں، اُن کی جڑ اسلام کے تعلق سے غلط رائے کا عام ہوجانا ہی ہے۔ جب تک یہ رائے درست نہیں ہوگی، اس وقت تک صورت حال بہتر نہیں ہوسکتی۔

یہاں جو بحث کی جارہی ہے، اس کا تعلق ایشوز کے حوالے سے بننے والی رائے عامہ سے ہے۔ اس میں اور مکمل دعوت دین کے قبول عام میں یقیناً فرق ہے۔ لیکن اسلام کے حوالے سے رائے عامہ کا درست ہونا یہ، دعوت دین کے قبول عام کے لیے ضروری ہے اور اس سمت ایک اہم مرحلہ ہے۔

یہ حالات کا نہایت شدید تقاضا ہے کہ مسلمان پوری قوت کے ساتھ اس اہم کام کی طرف متوجہ ہوں اور اس پر اپنی کوششوں اور توجہات کا بڑا حصہ مرکوز کردیں۔ دعوت دین اور رائے عامہ کی تربیت کا کام چند گروہوں تک محدود نہ رہے بلکہ یہ پوری امت کا ایجنڈا بنے۔

ہم اگلی سطروں میں واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ رائے عامہ کی تربیت ایک ہمہ جہت کام ہے اور کئی محاذوں پر منصوبہ بند کوششوں کا تقاضا کرتا ہے۔

رائے عامہ (public opinion) کیا ہے؟

گذشتہ دو تین صدیوں میں رائے عامہ کا موضوع علمی حلقوں میں متعدد پہلوؤں سے زیر بحث رہا ہے۔ سیاسیات (political science)، سماجیات (sociology)، سماجی نفسیات (social psychology)، تاریخ (history)، ابلاغیات (communication studies) وغیرہ متعدد شعبہ ہائے علم میں یہ موضوع زیر بحث رہا ہے کہ رائے عامہ کسے کہتے ہیں؟ وہ کیسے بنتی اور بدلتی ہے؟ کیا عناصر اس پر اثر انداز ہوتے ہیں؟ اس کو بنانے اور بگاڑنے والی قوتیں کون سی ہوتی ہیں؟

رائے عامہ، افراد کی آرا کے مجموعے کو نہیں کہتے بلکہ اُس بااثر رائے کو کہتے ہیں جو سماج کے احوال پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کسی بھی سماج میں مختلف آرا رکھنے والے، چھوٹے چھوٹے اقلیتی گروپ ہوتے ہیں اور اُن کے ساتھ عظیم اکثریت ہوتی ہے جس کی کوئی رائے نہیں ہوتی۔ مختلف عوامل کی وجہ سے کسی ایک بااثر اقلیتی گروپ کی رائے سماج کو متاثر کرتی ہے اور یہی رائے عامہ کہلاتی ہے۔[۳]

رائے عامہ کسی مسئلہ یا موضوع (issue) کو بنیاد بناکر تشکیل پاتی ہے۔ رائے عامہ بننے کے لیے پہلی ضرورت یہ ہے کہ عوام کی ایک بڑی تعداد اُس مسئلہ کو اہمیت دے اور اس پر بات کرنے

کے لیے تیار ہو۔ پھر ایک قابل لحاظ تعداد اس مسئلہ پر خاص رائے رکھے اور وہ رائے سماج کے احوال پر اثر انداز ہو۔[۴]

سماجی نفسیات کے ماہرین یہ مانتے ہیں کہ رائے عامہ اکثر صورتوں میں اقلیتی رائے ہوتی ہے۔ ایک بااثر اقلیت (elite minority) جو بعض دفعہ بہت چھوٹی اقلیت ہوتی ہے، اپنے نقطہ نظر کو اس طرح عام کر دیتی ہے کہ وہ پوری سماج کی رائے محسوس ہونے لگتی ہے۔ بعض اوقات رائے عامہ کسی بڑے بحران کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ کوئی سنگین سماجی مسئلہ، حادثہ یا بڑا واقعہ، سماج میں شدید رد عمل پیدا کرتا ہے۔[۵] اس رد عمل کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے جذبات و احساسات کا بااثر اقلیت استحصال کرتی ہے۔ انھیں علمی زبان اور توجیہات فراہم کرتی ہے۔ اس طرح رائے عامہ تشکیل پاتی ہے۔ عوام میں اس کی ترویج، اُس مباحثہ (elite discourse) سے ہوتی ہے جو بااثر طبقات سماج میں چھیڑتے ہیں۔[۶]

رائے عامہ کا انحصار کچھ اعتقادات (beliefs) پر ہوتا ہے۔ مثلاً یہ اعتقاد کہ ہماری قوم دنیا کی بہترین قوم ہے، یا یہ کہ ملک کی معاشی ترقی آزاد مارکیٹ کے ذریعے ہی ممکن ہے یا یہ کہ دنیا میں دہشت گردی کا سبب کچھ خاص مذہبی عقائد ہیں۔ وغیرہ۔ چھوٹے اقلیتی گروپ ایسے معتقدات کو عام کر دیتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں احوال و واقعات کو دیکھنے کا ایک خاص زاویہ عام ہو جاتا ہے۔ مثلاً آزاد مارکیٹ کے نظریہ میں یقین رکھنے والی رائے عامہ، کساد بازاری اور معاشی بدحالی کے اسباب ہمیشہ اُن حکومتی پالیسیوں میں تلاش کرتی ہے جو غریبوں کی فلاح و بہبود کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ اس نقطہ نظر کی بنیاد پر مستقبل کو دیکھنے کا ایک خاص زاویہ اور کچھ اجتماعی ارادے وجود میں آتے ہیں۔ مثلاً انتہاپسندانہ قوم پرستی کا عقیدہ اس فاشسٹ اور استعماری ارادے کو جنم دیتا ہے کہ ہمیں اپنی قوم کو ہر صورت میں دنیا بھر میں غلبہ دلانا ہے۔

رائے عامہ ہمیشہ نازک اور غیر مستحکم ہوتی ہے۔ اسے ریت (shifting sands) سے تشبیہ دی جاتی ہے جو مستقل ایک شکل میں نہیں رہتی۔ ایک واقعہ یا حادثہ برسوں کی محنت سے بنی رائے عامہ کو بدل کر رکھ سکتا ہے۔

ماہر معاشیات تیمور کرن نے اپنی کتاب Private Truths, Public Lies میں ایک مشہور نظریہ پیش کیا ہے جسے تغلیط ترجیح (preference falsification) کی تھیوری کہا جاتا ہے۔[۷] اس نظریہ کے مطابق جدید جمہوری معاشروں میں زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کی اکثریت جو رائے ظاہر کرتی ہے وہ اُن کی حقیقی رائے نہیں ہوتی۔ لوگ وہ رائے ظاہر کرتے ہیں جن کے بارے میں ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ یہ زیادہ سماجی طور پر قابل قبول ہے۔

کسی رائے کو سماجی طور پر قابل قبول بنانا ایک چھوٹی سی با اثر اقلیت کا کام ہوتا ہے۔ اگر ایک چھوٹی اقلیت اپنی رائے میں ثابت قدم اور بے لچک ہو تو بالآخر وہ رائے سماجی طور پر قابل قبول ہو جاتی ہے۔ چوں کہ اکثریت کی اپنی کوئی پائیدار رائے نہیں ہوتی اس لیے وہ اس اقلیتی رائے کو اپنی رائے کے طور پر بیان کرنے لگتی ہے اور جیسا کہ اوپر تغلیط ترجیح کے نظریہ کے حوالے سے کہا گیا، اکثر صورتوں میں اکثریت کا یہ اظہار رائے، اس کے دل کی حقیقی آواز کے خلاف ہوتا ہے۔ بعض سماجی سائنس دانوں نے ریاضی کے ترقی یافتہ ماڈلوں کے ذریعے اُس فارمولے کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے جس کے مطابق ایک چھوٹی سی اقلیت کی رائے پورے سماج کی رائے بن جاتی ہے۔ اس ریاضیاتی ماڈل کے مطابق کسی رائے پر استقامت کے ساتھ قائم لوگوں کی تعداد جب تک دس فی صد سے کم ہوتی ہے، وہ رائے اقلیتی رائے رہتی ہے۔ جیسے ہی دس فی صد کی حد پار کرتی ہے (یعنی کسی رائے پر قوت و استقامت کے ساتھ جمے رہنے والوں کی تعداد سماج کی مجموعی آبادی کے دس فی صد سے متجاوز ہوتی ہے) وہ رائے جنگل کی آگ کی طرح تیزی سے پورے سماج میں عام ہو جاتی ہے۔[۸]

رائے عامہ کو بنانے میں با اثر اقلیت کا elite کا اہم رول ہوتا ہے۔ انھیں رائے عامہ کے واسطے (agencies of public opinion) کہا جاتا ہے۔ یہ درج ذیل افراد اور اداروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔[۹]

❶ عوامی بحث کے ذریعے رائے عامہ کو متاثر کرنے والے: ان میں مصنفین، محققین، شاعر، ادیب، صحافی، فلم ساز، گیت کار وغیرہ ہوتے ہیں جو آئیڈیا کو زبان عطا کرتے ہیں اور عوام تک پہنچاتے ہیں۔

❷ عمل کے ذریعے رائے عامہ کو متاثر کرنے والے: یہ وہ باخبر اور سرگرم لوگ ہوتے ہیں جو سماج کی سیاسی اور سماجی زندگی میں فعال حصہ لیتے ہیں۔ اپنے اقدامات اور سرگرمی کے ذریعے رائے عامہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

❸ رائے عامہ کو بیدار کرنے والے: یہ وہ جہد کار ہوتے ہیں جو اپنی مہمات، احتجاج، پر جوش تقریروں اور نعروں اور تحریکوں کے ذریعے رائے عامہ کو بیدار کرتے ہیں۔

رائے عامہ کو بنانے میں ان تینوں واسطوں کا اہم رول ہوتا ہے۔

اس موضوع کے ان تکنیکی پہلوؤں کو یہاں چھیڑنے کا مقصد یہ ہے کہ ان سے ہمارے ملک کی موجودہ صورت حال کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور اس سے اس صورت حال کو بدلنے کے طریق کار کے سلسلہ میں بھی رہ نمائی ملتی ہے۔ ہمارے ملک کی اکثریت آج بھی فرقہ پرست نہیں ہے لیکن ایک چھوٹی سی فرقہ پرست اقلیت کی پامردی اور جہد مسلسل نے ایسی عارضی صورت حال پیدا کر دی ہے کہ عوام کی ایک بڑی تعداد، اس اقلیت کے نقطہ نظر کے ساتھ خود کو وابستہ کرنے پر سماجی لحاظ سے مجبور ہو چکی ہے۔ اس صورت حال کو بدلنے کا فارمولہ بھی یہی ہے کہ اسلام کی ہم نوا اقلیت، اسی ثبات و پامردی کے ساتھ اکثریتی نقطہ نظر کو متاثر کرے۔ اس کے لیے ہم کو کیا کرنا ہوگا اور اپنے رویہ اور حکمت عملی میں کیا تبدیلیاں لانی ہوں گی، اس سلسلہ میں کچھ باتیں ذیل کی سطروں میں بیان کی جا رہی ہیں۔

اسلام کے حق میں رائے عامہ کی تشکیل

مذکورہ بالا باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہم اسلام کے حق میں رائے عامہ بنانا چاہتے ہیں تو ملّی سرگرمیوں اور ملّی مزاج کے پورے پیراڈائم کو بدلنا ضروری ہے۔ اقلیتوں نے ہمیشہ اور ہر دور میں رائے عامہ کو متاثر کیا ہے، لیکن گھیتوؤں (عام آبادی سے الگ تھلگ، اپنے میں آپ رہنے والے گروہ (ghettos) نے کبھی رائے عامہ پر اثر نہیں ڈالا ہے۔ اگر کچھ اثر ڈالا بھی ہے تو منفی اثر ڈالا ہے۔ اگر ہم ملک کی رائے عامہ کو متاثر نہیں کر پا رہے ہیں تو اس کی وجہ ہمارا اقلیت ہونا نہیں ہے

بلکہ ہمارا گھیتو ہونا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم بااثر اقلیت نہیں بن پائے ہیں۔ ان دونوں اسباب کے ازالے اور ملک کی رائے عامہ کی ہم واری میں اہم اور موثر رول ادا کرنے کے لیے ہماری حکمتِ عملی، اجتماعی مزاج اور سرگرمیوں میں درج ذیل تبدیلیاں مطلوب ہیں۔

پہلی ضرورت: سماج سے اپنائیت کا تعلق

ملک کی رائے عامہ پر اپنے نقطہ نظر کا اثر ڈالنے کے لیے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہمارا گہرا تعلق ملک کے عام سماج سے ہو۔ اس ضمن میں رائے عامہ کی تشکیل کے درج ذیل اصول خصوصیت سے قابل توجہ ہیں۔

- ❑ **شناسائی اور اعتماد کا اصول (principle of familiarity and trust):** رائے عامہ کسی ایسے شخص یا گروہ کی رائے قبول نہیں کرتی جس پر اس کا اعتماد نہ ہو۔ آئیڈیا پیش کرنے والے سے واقفیت وشناسائی اور اس پر اعتماد، کسی آئیڈیا کے رائے عامہ بننے کی اہم شرط ہے۔[۱۰]
- ❑ **دل چسپی کا اصول (principle of interest):** لوگ اسی مسئلہ میں دل چسپی لیتے ہیں جس کے تعلق سے وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کا تعلق ان کی کسی خواہش، خوف، امید یا آرزو سے ہے۔[۱۱]

شناسائی کے اصول کا تقاضا ہے کہ ملک کے معاشرے سے ہمارا وہی تعلق ہو جو انبیا علیہم السلام کا اپنی قوموں سے تھا۔ انبیا علیہم السلام اپنی قوموں کے جانے پہچانے افراد تھے۔ قرآن مجید نے مختلف جلیل القدر انبیا کے بارے میں صراحت سے کہا ہے کہ وہ اپنی مدعو قوم کا حصہ تھے۔ **وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ** (ہم اِس سے پہلے موسیٰؑ کو بھی اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیج چکے ہیں اسے بھی ہم نے حکم دیا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لا اور انھیں تاریخ الٰہی کے سبق آموز واقعات سنا کر نصیحت کر۔ سورہ انبیاء، آیت ۵) وہ اپنی قوم کی زبان میں بات کرتے تھے۔ (**وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ**

رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمۡ (اور ہم نے ہر رسول اس کی قوم ہی کی زبان میں بھیجا کہ وہ انھیں صاف بتائے۔سورہ انبیاء، آیت ۴) قرآن نے بعض پیغمبروں کے سلسلہ میں "قوم کے بھائی" یا "ان کی برادری کا فرد" کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمۡ هُوۡدًا قَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ (اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا اس نے کہا "اے برادران قوم، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ سورہ اعراف، آیت ۶۵) قرآن نے انبیا علیہم السلام کے بارے میں متعدد جگہ یہ بات کہی ہے کہ وہ اپنی قوم کے خیر خواہ تھے۔اور ان کی خیر خواہی پر ان کی قوم کو اعتماد تھا۔اُبَلِّغُكُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّىۡ وَاَنَا لَـكُمۡ نَاصِحٌ اَمِيۡنٌ (تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، اور تمہارا ایسا خیر خواہ ہوں جس پر بھروسا کیا جاسکتا ہے) (سورہ اعراف، آیت ۶۸)

یہ سنجیدہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا آج مسلمان اس ملک کے سماج سے اپنائیت کا یہ تعلق رکھتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ مختلف تاریخی وجوہ سے عملاً مسلمان، عام غیر مسلم سماج سے الگ تھلگ ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کے مسائل میں دل چسپی لینا اور ان سے خیر خواہی کا تعلق استوار کرنا تو دور، ان کے مسائل کا شعور بھی عام مسلمانوں کو کم ہی ہے۔ آج بھی ہمارے اکثر اہل فکر مسائل کو "ہمارے مسائل" اور "ان کے مسائل" میں تقسیم کر کے دیکھنے کے عادی رہے ہیں۔غیر مسلموں سے روز کے تعامل کے باوجود متنازعہ فیہ مسائل پر عام غیر مسلم ذہن کو جانبداری سے اوپر اٹھ کر، سمجھنے کی کوشش بہت کم ہوئی ہے۔ اس صورت حال میں ہم ملک کی رائے عامہ کو متاثر نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ جیسا کہ عرض کیا گیا، کسی آئیڈیا کے قابل قبول ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ملک کے عوام آئیڈیا پیش کرنے والے سے اپنائیت کا تعلق محسوس کریں۔اس کے لیے ہماری امیج میں بڑی تبدیلیاں درکار ہیں۔ پہلی ضرورت "ہم" اور "وہ" کی تفریق ختم کرنا ضروری ہے۔یہاں کی عام آبادی سے متعلق ہونے (related) ہونے کا داعیہ اور سلیقہ ہمارے افراد میں بھی اور ہماری جماعتوں اور تنظیموں میں بھی پیدا ہونا ضروری ہے۔ یہ یقین پیدا کرنا ضروری ہے کہ ہم اس ملک

کے تمام انسانوں کے خیر خواہ اور ان کے مسائل میں دل چسپی رکھتے ہیں۔ اور عام مسلمان نہ سہی، اسلامی فکر کے حاملین کی دل چسپی ملکی سماج کے تمام حصوں سے ہے۔

دل چسپی کے اصول کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارا ڈسکورس صرف دفاعی نہ ہو بلکہ عصر حاضر کے ملک کے مسائل کے حوالہ سے ہو۔ قرآن مجید نے انبیا علیہم السلام کی تعلیمات پر جو روشنی ڈالی ہے اُن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی نے اپنی قوم کے اُن مسائل کو اپنے ڈسکورس کا حصہ بنایا ہے جو اُس قوم کے نمایاں مسائل تھے۔[۲۱]

قولی دعوت کے آغاز سے پہلے مدعو قوم کے درمیان نبی کریم ﷺ کی یہ امیج بن چکی تھی کہ آپ اپنی قوم کے مسائل سے گہری دل چسپی رکھتے ہیں، اُس کے خیر خواہ ہیں اور اُس کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اس کا ثبوت ام المومنین حضرت خدیجہؓ کا وہ مشہور بیان ہے جو انھوں نے آنحضرت ﷺ پر نبوت کے نزول کے فوری بعد آپ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے دیا تھا کہ

> أَبْشِرْ، فَوَ اللّٰهِ لَا يُخْزِيکَ اللّٰهُ أَبَدًا، وَاللّٰهِ إِنَّکَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَصْدُقُ الْحَدِيثَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ (بشارت ہو، قسم ہے اللہ کی کہ وہ ہرگز آپ کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ آپ تو لوگوں کے ساتھ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، ناداروں کی کفالت کرتے ہیں، مہمانوں کی خاطر داری فرماتے ہیں اور مصائب و مشکلات میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔)[۳۱]

نبی کریم ﷺ کے زمانے میں آپ کے اولین مخاطب قریش تھے۔ چنانچہ قریش جن تاریخی حقائق سے واقف تھے، جو قصص ان کے قومی اساطیر یا لوک کتھاؤں کی حیثیت رکھتے تھے، اور جن تاریخی واقعات کے نظائر ان کی آنکھوں کے سامنے بکھرے ہوئے تھے، وہی قرآن کے استدلال اور ڈسکورس کی بنیاد بنے۔

> اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ (کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انھیں اُن لوگوں کا

انجام نظر آتا جو اِن سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ اِن سے زیادہ طاقت ور تھے اور ان سے زیادہ زبردست آثار زمین میں چھوڑ گئے ہیں مگر اللہ نے ان کے گناہوں پر انھیں پکڑ لیا اور اُن کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ سورہ غافر، آیت ۲۱)

اس کے علاوہ قریش جن باتوں کے دعوے دار تھے (مثلاً سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے نسبت اور ان کی اتباع کا دعوی) اُن باتوں پر بھی دلیل کی عمارت کھڑی کی گئی۔ بعد میں مدینہ ہجرت کے بعد جب اہل کتاب کو مخاطب کیا گیا تو ان کے معتقدات اور ان کے دعووں ہی کی بنیاد پر قرآن نے اپنی دعوت کے لیے دلائل فراہم کیے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿٦٤﴾ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَالْإِنجِيلُ إِلَّا مِن بَعْدِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٦٥﴾

(کہو، "اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے" اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی و اطاعت کرنے والے) ہیں۔ اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑا کرتے ہو؟ تورات اور انجیل تو ابراہیم کے بعد ہی نازل ہوئی ہیں پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔ سورہ آل عمران، آیت ۶۴)

رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس ملک کے عام سماج سے ہماری قربت بڑھے، اس کے مسائل میں ہم سرگرمی سے حصہ لیں، اس سماج سے ہماری گہری واقفیت ہو اور اس کی تاریخ، فلسفہ، مزاج، روایات وغیرہ کا ہمیں گہرا شعور ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے دینی و تہذیبی تشخص کے تحفظ کے لیے اپنی علٰحدہ ملّی شناخت کی بھی ضرورت ہے، لیکن اس شناخت کے تحفظ کے تقاضوں اور مدعو قوم سے سماجی قربت کے تقاضوں کے درمیان

مناسب اعتدال کا راستہ ہمیں تلاش کرنا ہوگا۔

دوسری ضرورت: رائے عامہ کے واسطوں کی تشکیل

رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کے لیے ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ اہل اسلام کی ایک بڑی تعداد اسلام کی تعلیمات پر پوری استقامت کے ساتھ جم جائے اور اسلام کی داعی اور علم بردار بن جائے۔ برادران وطن کے درمیان سے بھی اسلام کو اعوان و انصار ملیں اور اسلام کے مختلف اصولوں کے حق میں، کم سے کم آبادی کا دس فی صد حصہ پر زور انداز میں اور اعتماد و یقین کے ساتھ اپنی رائے پیش کرنے کی پوزیشن میں آئے۔ مثلاً مسلمانوں کے ساتھ برادران وطن کی ایک بڑی تعداد، اس یقین کا اظہار کرنے لگے کہ اسلام کا خاندانی نظام عورت، مرد، خاندان اور معاشرے کے لیے باعث رحمت ہے یا یہ کہ سود اور قمار سے پاک اسلام کا مالیاتی نظام معاشی ترقی اور ازالہ غربت کے لیے ناگزیر ہے۔ وغیرہ۔

اوپر جن اداروں یا افراد کی، رائے عامہ کے واسطوں (agencies of public opinion) کی حیثیت سے تعیین کی گئی ہے، ان کی اہل اسلام کی صفوں میں موجودگی بھی ناگزیر ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اسلام کی نمائندگی کرنے والوں کے درمیان اعلیٰ درجہ کے مصنفین، محققین اور کالم نگار ہوں، ادب اور فنون لطیفہ کے تخلیق کار اور فن کار ہوں۔ ملک کے عام مسائل میں بھر پور دل چسپی لینے والے اور ان کا حل فراہم کرنے والے افراد، ادارے اور تنظیمیں ہوں۔ ملکی سماج کے ایشوز پر سرگرمی سے کام کرنے والے جہد کار ہوں جو ان ایشوز کے حوالہ سے رائے عامہ کو بیدار کر سکیں۔

تیسری ضرورت: بااثر طبقات پر توجہ

اسلام کے حق میں رائے عامہ کی تربیت کے لیے ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ سماج کے بااثر طبقات پر توجہ مرکوز کی جائے اور بااثر طبقات کے درمیان جاری مباحثوں (elite discourse) میں سرگرمی سے حصہ لیا جائے۔ اس وقت حالات کی وجہ سے اسلام عوامی مباحثہ کا موضوع بن گیا ہے

اس لیے کسی آئیڈیا کے عوام میں مقبول ہونے کی پہلی شرط کہ عوام کی ایک بڑی تعداد اُس کو اہمیت دے اور اُس پر بات کرنے کے لیے تیار ہو، اسلام کے سلسلہ میں پوری ہو چکی ہے۔ اب یہ چیلنج باقی نہیں رہا کہ لوگ اسلام کے ایشو میں دل چسپی ہی نہیں لیتے۔ اب ضرورت اگلے مرحلے کی ہے کہ بااثر طبقات کی رائے اسلام کے حق میں مثبت بنے۔ اس مرحلے کے کئی تقاضے ہیں۔

پہلا تقاضا یہ ہے کہ اسلام کے حق میں سنجیدہ علمی بحث کھڑی کی جائے۔ "جدید علم کلام" کی ضرورت پر حالیہ چند برسوں میں بہت سے اہل علم نے لکھا ہے۔ دور جدید کے معروف علمی طریقہ ہائے کار (methods) کو بنیاد بنا کر اسلام کے حق میں سنجیدہ مضامین اور کتابوں کی انگریزی، ہندی اور علاقائی زبانوں میں تصنیف اور اعلی و معیاری علمی مجلوں میں مضامین کی اشاعت اور اس بات کو یقینی بنانا کہ یہ مضامین یونیورسٹیوں اور اعلی علمی اداروں میں زیر بحث آجائیں، یہ امت مسلمہ کا آئندہ چند برسوں میں اہم ہدف ہونا چاہیے۔ اس کام کا اولین تقاضا یہ ہے کہ ہماری صفوں میں ایسے ذہین اہل علم ہوں جو اسلام کے ساتھ جدید سماجی علوم میں گہری بصیرت رکھتے ہوں۔ معاصر ذہن کو اچھی طرح سمجھتے ہوں اور عہد حاضر کے علمی اسلوب میں زمانہ کو مخاطب کر سکتے ہوں۔ اس بات پر سنجیدگی کے ساتھ توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ ہمارے ذہین ترین افراد کی ایک قابل لحاظ تعداد اس کام کے لیے یکسو ہو اور امت اس کام کے لیے ان کو ضروری وسائل فراہم کرے۔ دائمی شریعت کا اسلامی تصور، اسلام میں عورت کا مقام اور اسلام کے عائلی قوانین، اسلام کے واحد حق ہونے کا اعتقاد اور غیر مسلموں کے بارے میں اسلام کے نظریات، تصور جہاد وغیرہ، یہ چند اہم موضوعات ہیں جو منفی رائے عامہ کی اصل بنیاد ہیں۔ ان سب موضوعات پر اعلی معیار کی علمی بحث کھڑی کرنے میں جب تک ہم کام یاب نہیں ہوتے، ہم رائے عامہ کو مثبت طور پر متاثر نہیں کر سکتے۔ اس دفاعی بحث کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے زیادہ ضروری ہے کہ دور حاضر کے سنگین مسائل کے حوالہ سے اسلامی معتقدات اور اسلامی اقدار و طرز زندگی کی ضرورت و معقولیت پر اعتماد و یقین کے ساتھ لیکن سنجیدہ علمی اسلوب میں جدید کلامی لٹریچر تیار ہو۔ اس وقت ہمارا ملک بہت سے مسائل سے

دوچار ہے۔ ان مسائل کے مختلف حل پیش ہورہے ہیں۔اس بحث میں ہمیں حوصلہ اور اعتماد کے ساتھ حصہ لیناچاہیے۔ آئیڈیاز کی تخلیق کے عمل میں بھر پور (contribution) تعاون پیش کرنا چاہیے۔اگر اسلام کی روح اور شریعت اسلامی کے مزاج اور مقاصد کو ملحوظ رکھ کر ہم تخلیقی انداز سے (creatively) غور کریں تو ترقیاتی پالیسی، مالیاتی نظم، ماحولیات، تعلیم خاندان اور طرز زندگی کے حوالے سے بہت سے آئیڈیا اہل اسلام پیش کر سکتے ہیں۔ یہ آئیڈیا اسلام کے نام اور حوالے کے ساتھ بھی پیش کیے جاسکتے ہیں اور اگر ضرورت متقاضی ہو تو نام کے بغیر بھی۔اس کے لیے فعال تھنک ٹینکوں کا قیام اور ان کی جانب سے مستقل بلند پایہ تحقیقات کی اشاعت نیز علمی محفلوں، سیمیناروں، پالیسی مباحث، حکومت کے مشاورتی اجلاسوں، ٹی وی کے مباحث اور اخباروں اور رسالوں کے کالموں میں بھر پور شمولیت ضروری ہے۔

دوسرا تقاضا یہ ہے کہ میڈیا میں ہماری آواز مستحکم ہو۔ امت کے حلقوں میں میڈیا کی بات ایک عرصہ سے چل رہی ہے لیکن عام طور پر میڈیا کی بات صرف مسلمانوں کے مسائل کے حوالے سے ہوتی ہے۔ میڈیا کو اسلام کے حق میں اوپینین ڈسکورس کا ذریعہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اچھے کالم نگاروں کی ایک بڑی تعداد اس مقصد کے لیے تیار ہو۔

تیسرا تقاضا یہ ہے کہ ملک کے بااثر طبقات کے ساتھ مسلمان اہل علم کی گفت وشنید اور تبادلہ خیال کی سنجیدہ فضا بنے۔اس کام پر مختلف وجوہ سے ابھی تک بہت کم توجہ ہوپائی ہے۔اب ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ کام مسلمانوں کی تمام جماعتوں، علماء اور اہل علم کے ایجنڈے میں نمایاں مقام حاصل کرے کہ سماج کے سر کردہ لوگ، صحافی، دانشوران، مذہبی قائدین، جہد کار، نامور پروفیشنل، سماجی وسیاسی قائدین، افسران، وغیرہ سے مسلسل ملاقاتیں ہوں اور انھیں اسلام سے متعارف کرایا جائے۔ انبیا علیہم السلام کے اسوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی دعوت کا آغاز سماج کے بااثر طبقات کو مخاطب کرنے سے کیا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے خود اپنے اُس خاندان کو دعوت دی جو قوم کی مذہبی پیشوائی کی مسند پر متمکن تھا۔ پھر اُس بادشاہ کو دعوت دی جس کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار کی باگ تھی اور جو اپنے آپ کو لوگوں کی زندگی اور موت کا مالک سمجھے ہوئے بیٹھا تھا... حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ سب سے پہلے فرعون کو مخاطب کریں... حضرت مسیح علیہ السلام نے سب سے پہلے علمائے یہود کو دعوت دی۔ اِسی طرح حضرات نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام، شعیب علیہ السلام، سب کی دعوتیں قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ اِن میں سے ہر نبی نے سب سے پہلے اپنے وقت کے ارباب اقتدار اور متکبرین کو جھنجھوڑا اور اُن کے افکار و نظریات پر ضرب لگائی۔ سب سے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ کو حکم ہوا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔ یہ لوگ عرب کی مذہبی اور پدرسرانہ (patriarchical) حکومت کے ارباب حل و عقد تھے اور اِس کے واسطہ سے سارے عرب کی اخلاقی اور سیاسی رہ نمائی کر رہے تھے۔[۴۱]

چوتھی ضرورت: عملی نمونوں کا ظہور

رائے عامہ کی تشکیل کا ایک اہم اصول وہ ہے جسے عمل کا اصول (principle of action) کہا جاتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگ ایسے کسی آئیڈیا میں دل چسپی نہیں لیتے جو عمل اور عملی امور کے ساتھ وابستہ نہ ہو۔ لوگ اسی آئیڈیا پر بھروسا کرتے ہیں جو آئیڈیا پیش کرنے والا خود کر کے دکھائے، یا لوگوں کو یقین ہو کہ وہ عنقریب اسے روبعمل لاسکتا ہے یا لوگ خود اس پر عمل کر کے اس کی سچائی کی جانچ کرسکتے ہیں۔ عمل کے واضح خاکے کے بغیر کسی آئیڈیا کو رائے عامہ قبول نہیں کرتی۔ عمل کے اصول کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی طرز زندگی اور اسلامی قدروں کے عملی نمونے کثرت کے ساتھ لوگوں کے سامنے آتے رہیں۔ یعنی مسلمان اپنے انفرادی و اجتماعی رویوں سے اسلام کی بھی وضاحت کریں اور اس کا حق اور نفع بخش ہونا ثابت بھی کریں۔ داعیوں کے عمل اور

داعی گروہ کے اجتماعی رویوں سے اسلام سمجھ میں آنے لگے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان صرف مسلمانوں تک محدود نہ رہیں بلکہ عام ملکی سماج میں ایک فعال زندگی گزاریں، سماج کے مسائل میں اقدامی انداز میں حصہ لیں، اور اس شمولیت (engagement) کے دوران اپنے اثرات چھوڑتے جائیں۔

مسلمان خاندانوں کے روابط برادران وطن کے خاندانوں سے استوار ہوں اور اسلام کی عائلی تعلیمات کی برکتوں کے عملی مشاہدے کا انھیں موقع ملے۔ مساجد، مدارس وغیرہ میں عام آبادی کو مدعو کرنے کا رجحان گذشتہ چند برسوں سے پیدا ہوا ہے۔ اس کو بہت زیادہ عام کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلامی اصولوں کے مطابق منعقد ہونے والی نکاح کی تقاریب میں، رمضان وعید وغیرہ کی سرگرمیوں میں، حج وعمرہ کے تربیتی پروگراموں میں، زکوۃ و فطرہ کی تقسیم کے عمل میں اور اس طرح کی دیگر مذہبی سرگرمیوں میں، ان کو قریب آنے اور مشاہدہ کرنے کا موقع ملے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی اداروں سے اسلامی نظام زندگی کے نفع بخش پہلو نمایاں ہو کر اہل ملک کے سامنے آئیں۔ ہمارے اسکول، ہاسپٹل، رفاہی ادارے اور تحریکیں اور ان کا اندرونی ماحول، یہ سب غیر اسلامی صحراؤں میں اسلام کے ایسے نخلستان بن سکتے ہیں جہاں کی ٹھنڈی ہوا، سائے اور میٹھے پانی کی طرف ہر پیاسا مسافر کشش محسوس کر سکے۔ ملک میں جہاں بھی اسلامی مائکرو فائنانس وغیرہ کے تجربات ہوئے ہیں، ان کے بہت اچھے تاثرات سامنے آرہے ہیں۔ آئندہ اسلامی تکافل وغیرہ کی اسکیمیں بھی عام ہو جائیں تو اسلامی نظام مالیات ومعاشیات کی عملی برکتیں نمایاں ہو سکیں گی۔

موجودہ دور میں میڈیا اور خاص طور پر سوشل میڈیا کا بھی رائے عامہ کی تربیت میں بہت اہم رول ہے۔ اسی طرح واقعات (events) اور حوادث (crises) بھی رائے عامہ کو تیزی سے ایک رخ دینے کا کام کرتے ہیں۔

(زندگی نو، ستمبر ۲۰۱۹)

حواشی و حوالہ جات

۱۔ مرکز جماعت اسلامی ہند (۲۰۱۷)، دستور جماعت اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، دفعہ ۵ شق ۳، ص ۸

۲۔ شعبہ تنظیم جماعت اسلامی ہند (۱۹۷۸)، مقالات و مختصر روداد اجتماع بھوپال، ص ۹۴

۳۔ Kimball Young (1935) Social Psychology, an Analysis of Social Behaviour, Crofts, California.

۴۔ Davison, W. P. (1958). The public opinion process. Public Opinion Quarterly, 22,pp 91–106.

Glynn, C. J. (2005). Public opinion as a social process. In Dunwoody, S., Becker, L.B., McLeod, D.M., & Kosicki, G.M. (Eds.) The evolution of key mass communication concepts, pp 139–163. Cresskill, NJ: Hampton Press.

۵۔ Hajo G. Boomgaarden, Claes H. de Vreese, International Journal of Public Opinion Research, Volume 19, Issue 3, Autumn 2007, pp 354–366.

۶۔ Epilogue "The Question of Elite Domination on Public Opinion" in Zaller John R, (2003), The Nature and Origins of the Mass Opinion, Cambridge University Press, Cambridge UK.

۷۔ Timur Kuran, (1997), Private Truths, Public Lies: The Social Consequences of process Falsification, Harvard University Press, p 384.

۸۔ اس ریاضیاتی ماڈل کے تفصیلی مطالعہ کے لیے دیکھیے:

J. Xie, S. Sreenivasan, G. Korniss, W. Zhang, C. Lim, and B. K. Szymanski,Social consensus through the influence of committed minorities, in Phys. Rev. E 84, 011130 – Published 22 July 2011.

۹۔ James Bryce, as quoted in Francis G. Wilson "James Bryce on Public Opinion: Fifty Years Later" in The Public Opinion Quarterly, Oxford University Press.

۱۰؎ Earl Newsom, as quoted in Scott M. Cutlip and Allen H. Centre (1971) Effective Public Relations, Prentice Hall, pp 152

۱۱؎ ایضاً

۱۲؎ قرآن مجید میں انبیا علیہم السلام کی دعوت کی تفصیل متعدد جگہ آئی ہے۔ سورہ شعراء میں خاص طور پر اختصار کے ساتھ مختلف انبیا کے اٹھائے ہوئے ایشوز کا ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت ہودؑ نے قوم عاد کی مادہ پرستی اور بجا عمارت سازی کو (سورہ شعراء، آیات ۱۲۸ تا ۱۳۰) حضرت صالح نے قوم ثمود کے اسراف اور نام و نمود کو (سورہ شعراء، آیات ۱۴۶ تا ۱۵۲) حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کی جنسی بے راہ روی کو (سورہ شعراء، آیات ۱۶۵ اور ۱۶۶) اور حضرت شعیبؑ نے مالی و تجارتی بد عنوانیوں کو (سورہ شعراء، آیات ۱۸۱ تا ۱۸۳) ایشو بنایا تھا۔

۱۳؎ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بدء الوحي الی رسول اللہ ﷺ روایت ام المومنین عائشہ صدیقہ حدیث نمبر ۴۰۳

۱۴؎ امین احسن اصلاحیؒ، دعوت دین اور اس کا طریقہ کار، ص ۴۹ تا ۵۲

رائے عامہ کی تشکیل اور ذرائع ابلاغ

رائے عامہ کی کوئی بحث ذرائع ابلاغ یا میڈیا کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ رائے عامہ کی درست رخ پر تشکیل کے لیے میڈیا کا صحیح فہم اور شعور بھی ضروری ہے اور اس پر مناسب توجہ بھی۔ میڈیا کا موضوع ہمارے علمی و فکری حلقوں کے لیے کوئی نیا موضوع نہیں ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر مسلسل بحث کے باوجود، اس کے سلسلے میں درست رویہ تشکیل نہیں پاسکا ہے۔

رائے عامہ اور میڈیا

صنعتی انقلاب کے بعد ہی سے میڈیا کی اہمیت تیزی سے بڑھنے لگی اور رائے عامہ کی تشکیل میں اس کا رول نہایت اہم ہوتا گیا۔ اس صدی کے آغاز میں یہ بات کہی جاتی تھی کہ میڈیا کے سات اجزا (پرنٹ میڈیا، آڈیو ویڈیو ریکارڈز، سنیما، ریڈیو، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ اور سیل فون) کا عوامی ذہن بنانے میں سب سے اہم اور کلیدی رول ہے۔ گذشتہ دو دہوں میں، میڈیا کی ایک بالکل نئی قسم نے جنم لیا جسے ہم عرفِ عام میں سوشل میڈیا کہتے ہیں یعنی ویب ٹو پوائنٹ زیرو (Web 2.0) سے متعلق وہ انٹرنیٹ اپلی کیشن جن کے ذریعے ایک عام آدمی اپنا مواد تخلیق کرسکتا ہے اور اسے آزادانہ طور پر، سامعین و ناظرین کی ایک تعداد تک پہنچا سکتا ہے۔ اب دنیا میڈیا کی آٹھویں بڑی قسم کی طرف تیزی سے پیش رفت کر رہی ہے جسے 'اضافہ شدہ حقیقت' (augmented reality) کہا جاتا ہے۔[1] ہولوگرام اور ہولو لینس جیسی ترقی یافتہ ٹکنالوجی کے ذریعے میڈیا کا مواد اس طرح سامنے لایا جاتا ہے کہ استعمال کرنے والے کے لیے یہ پیش کش حقیقی دنیا کے تجربے (real life experience) کی

حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ میڈیا کی تخلیق کردہ فرضی دنیا استعمال کرنے والے کے پانچوں حواس پر اثر انداز ہوتی ہے، یہاں تک کہ اس کا لاشعور اُسے اس فرضی دنیا کا حصہ بنادیتا ہے۔ اس وقت سوشل میڈیا پر خصوصاً انسٹاگرام جیسے پلیٹ فارموں پر اس صورت حال کے ابتدائی تجربات شروع ہو چکے ہیں۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ آگمینٹیڈ رئیلٹی کا آنے والا انقلاب انٹرنیٹ سے بھی کہیں زیادہ ہمہ گیر ہو گا اور گہرے نفسیاتی اور سماجیاتی اثرات کا حامل ہو گا۔[۲] مستقبل کے میڈیا سے متعلق ان باتوں کو پیش کرنے کا مقصد اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ میڈیا کا چیلنج آنے والے دنوں میں اور شدت اختیار کرے گا۔ اس لیے اس پر بھرپور توجہ دینی ضروری ہے۔ رائے عامہ کی درست رخ پر تشکیل کا کام میڈیا پر بھرپور توجہ کے بغیر آج بھی ممکن نہیں ہے، آئندہ اور بھی دشوار ہوتا جائے گا۔

سماجی ترغیب و تشویق (social persuasion) ماس میڈیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ میڈیا نے انسانوں کے درمیان راست سماجی تعلقات نہایت کم زور کر دیے ہیں اور ایک پڑھے لکھے آدمی کو راست معلومات کے حصول کے معاملے میں نہایت کاہل بنادیا ہے۔ وہ اپنے آس پاس ہونے والے واقعات کی بھی راست معلومات حاصل کرنے کی کوشش بہت کم کرتا ہے اور اس کے لیے اس کا میڈیا پر انحصار بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ شہروں میں ایسے واقعات عام ہیں کہ محلے میں ہونے والے قتل کے واقعے کی معلومات پڑوسیوں کو اخبار یا ٹی وی سے ملتی ہے۔ چنانچہ لوگوں کو کیا معلومات ملنی چاہئیں اور کیا نہیں، کن باتوں کو اہمیت دی جانی چاہیے اور کن کو نہیں، لوگوں کو کن باتوں پر سوچنا چاہیے اور کن پر نہیں، ان سب امور پر میڈیا کا کنٹرول خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صحیح اور غلط اور اچھے اور برے سے متعلق عوام کی رائے (value judgement) بالعموم میڈیا کے ذریعے تشکیل پاتی ہے۔ جن کے پاس میڈیا ہے، ان کے پاس گویا رائے عامہ کو کنٹرول کرنے کا لائسنس ہے۔ سوشل میڈیا کے چلن سے پہلے تک میڈیا بالعموم حکومتوں یا طاقت ور سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ چنانچہ رائے عامہ پر ان کا کنٹرول بھی بہت طاقت ور اور ہمہ گیر ہوا کرتا تھا۔

جمہوری معاشروں میں بظاہر میڈیا آزاد ہوتا ہے۔ لیکن چومسکی اور دیگر متعدد تجزیہ نگاروں نے واضح کیا ہے کہ جدید جمہوری معاشرے، قدیم معاشروں سے زیادہ انسانی فکر اور سوچ پر کنٹرول رکھتے ہیں۔ مثلاً چومسکی نے امریکی میڈیا کے بارے میں لکھا ہے کہ

> امریکی میڈیا کسی استبدادی ریاست کے پروپیگنڈہ سسٹم کے طور پر کام نہیں کرتا۔ یہ پر جوش مباحث، تنقید، اور اختلاف رائے کی نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ سب کچھ ان اصولوں اور مفروضات کے دائرے کے اندر ہو جن پر امریکی خواص کا اتفاق رائے (elite consensus) ہے۔ خواص کے اتفاق رائے کا یہ نظام اس قدر طاقت ور ہے کہ بغیر کسی شعور کے ہر شخص اس سے خود کو ہم آہنگ کرنے پر مجبور ہے۔[۳]

چومسکی نے جدید میڈیا کا پروپیگنڈہ ماڈل واضح کیا ہے کہ مذکورہ مقصد کے حصول کے لیے کیسے موضوعات کا انتخاب کیا جاتا ہے؟ مسائل اور ایشوز کو فریم کیا جاتا ہے، معلومات کی چھانٹی کی جاتی ہے، کیسے طے کیا جاتا ہے کہ کس بات پر زور دیا جائے اور کس بات کو کس لب ولہجہ میں بیان کیا جائے۔ اور کیسے اس بات کو یقینی بنایا جاتا ہے کہ مباحث طے شدہ سرحدوں سے کبھی تجاوز نہ کریں۔[۴]

کسی معاشرے میں جب میڈیا کا اثر بڑھ جاتا ہے تو واقعات اور احوال اپنے حقیقی تناظر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ شعور کی حرکت اور فہم وادراک کی تشکیل کا عمل فرد کی اپنی خودی ولاشعور کی بجائے، ایک بیرونی مصنوعی تناظر کے تابع ہو جاتا ہے۔ احوال وواقعات سے وہ وہی مطلب اخذ کرتا ہے جو میڈیا کرانا چاہتا ہے۔ اس طرح بظاہر مکمل آزادی ضمیر کے باوجود، اس کا ضمیر ایک بیرونی قوت کے تابع ہو جاتا ہے۔ اللهم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وأرنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه (اے اللہ ہم کو سچ بات کو سچ دکھا اور اس کے اتباع کی توفیق عطا کر اور جھوٹ کو جھوٹ دکھا اور اس سے اجتناب کی توفیق عطا کر) اس دعا میں جس عظیم نعمت کی خواہش کی گئی ہے، ایک میڈیا گزیدہ معاشرہ، اس سے محروم ہونے لگتا ہے۔

انسانوں کی معلومات، اُن کی رائے اور ان کے ضمیر پر یہ غیر معمولی کنٹرول، جدید تہذیب

کی لعنتوں میں سے ایک ہے۔ حریتِ فکر اور آزادی ضمیر، انسانی عز و شرف کی اہم ترین بنیادوں میں سے ہے۔ تہذیب جدید نے ان پر کئی طرح کے پہرے بٹھار کھے ہیں اور ان پہروں کا سب سے اہم اور کارگر واسطہ میڈیا ہی ہے۔ جو کام پرانے زمانوں میں، ظالم حکم رانوں کے استبدادی پنجے بھی پوری طرح نہیں کر سکے، دور جدید کی ٹکنالوجی اور ٹکنالوجی کے ذریعے چلنے والے میڈیا نے آسانی سے کر دکھایا ہے اور انسانوں کو بظاہر بھرپور آزادی دے کر کیا ہے۔

میڈیا اور تہذیبی استعمار

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ میڈیا کی یلغار اور اُس کا کنٹرول سسٹم صرف وقتی سیاسی مسائل تک محدود ہے۔ اگرچہ وقتی سیاسی اور معاشی مفادات، اس کنٹرول سسٹم کے اہم محرکات میں شامل ہیں لیکن اس کی گہری نظریاتی اور تہذیبی بنیادیں بھی ہیں۔ میڈیا کی پوری اسکیم میں نہایت خاموش اور غیر محسوس طریقے سے مغربی قدروں اور فلسفہ حیات کی ترویج کا سامان موجود ہے۔ بچوں کے لیے معصوم اور بے ضرر محسوس ہونے والے کارٹونوں کے ذریعے بھی اختلاط مرد وزن، کھلے عام بوسہ بازی وغیرہ جیسی دسیوں ایسی باتیں بچوں کے معصوم لاشعور میں نقش ہو جاتی ہیں جن کا گہرا تعلق بنیادی تہذیبی قدروں سے ہے۔ حجاب کے بارے میں میڈیا کی مسلسل یلغار کے ذریعے یہ ذہن بنایا جاتا ہے کہ یہ عورت پر ظلم اور مرد کے تسلط کی علامت ہے۔ جہاد کے بارے میں یہ ذہن بنایا جاتا کہ آج دنیا بھر میں دہشت گردی کے لیے اسلام کا یہ اہم رکن ذمہ دار ہے، بلکہ جہاد کا مطلب ہی دہشت گردی ہے اور 'جہادی' ایک گالی ہے۔ لباس کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ اس کا اولین مقصد ستر کی حفاظت ہے۔ يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا (اے اولاد آدم ہم نے تم پر لباس نازل کیا تا کہ تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہاری آرائش ہو۔ سورہ اعراف، آیت ۲۶) جب کہ میڈیا سے لباس کا جو تصور قائم ہوتا ہے اُس میں لباس، حسن کی نمائش اور اسٹیٹس کے اظہار کا ذریعہ اور فیشن کی علامت قرار پاتا ہے۔ میڈیا کے دھیمے زہر کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس سے متاثر ہونے والے مسلمانوں کے لیے بھی دھیرے دھیرے ستر کی حفاظت کا مقصد غیر

اہم ہونے لگتا ہے اور بے حیائی اور نیم عریانی میں کوئی تکلف محسوس نہیں ہوتا۔ وہ اپنے تہذیبی حصار اور اپنی معاشرتی سرحدوں سے پرے، میڈیا کی تخلیق کردہ ایک اجنبی مصنوعی دنیا میں رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اس کا اثر قبول کرنے لگتے ہیں۔ اس اجنبی دنیا کی تہذیبی قدریں، سیاسی مزعومات، معاشی مفادات اور لائف اسٹائل سے متعلق ترجیحات وہی ہوتی ہیں جو میڈیا کی پسندیدہ تہذیب یعنی مغربی تہذیب کی ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک میں اب یہی رول یہاں کا میڈیا، دائیں بازو کے عناصر کی سیاسی و تہذیبی ترجیحات کی خاطر ادا کر رہا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کے میڈیا کا یہ رول عالمی میڈیا سے زیادہ شدید، جارح اور استبدادی ہے۔ آنے والے برسوں میں، جب آگمینٹیڈ رئیلٹی میڈیا کی سب سے بڑی حقیقت بن کر سامنے آئے گی تو اس وقت یہ چیلنج کس قدر پیچیدہ ہو جائے گا، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید نے نضر بن حارث کے ایک خاص کیرکٹر پر تبصرہ کیا ہے جو لوگوں کو دین حق سے دور کرنے کے لیے لہو الحدیث لے آیا تھا۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ (اور انسانوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام دلفریب خرید کر لاتا ہے تا کہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے علم کے بغیر بھٹکا دے۔ سورہ لقمان، آیت ۶) تفریحی میڈیا کا ایک سرسری جائزہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ دور جدید کا نضر بن حارث ہے۔ یہ ہمارے بچوں کے اندر خواب پیدا کرتا ہے تو سیلیبریٹی بننے کا خواب پیدا کرتا ہے۔ وہ فلمی اداکاروں اور کشتی اور باکسنگ کے اکھاڑہ بازوں میں اپنا آئیڈیل تلاش کرنے لگتے ہیں۔ کارٹون کے بے جان اور خیالی کیرکٹر ان کے خوابوں اور تمناؤں کے مرکز بن جاتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی نقصان نہیں ہے، اس سے تعمیرِ شخصیت کے عمل کی سمت ہی بدل جاتی ہے۔

کئی تجزیہ نگاروں نے[۵] واضح کیا ہے کہ میڈیا اکثر معاشروں میں یہ صورت حال بھی پیدا کر دیتا ہے کہ لوگ جھوٹ کے عادی بن جاتے ہیں۔ وہ جھوٹ کو جھوٹ سمجھ کر بھی اس کا اثر قبول کرتے ہیں اور اس کی بنیاد پر اپنا رویہ تشکیل دیتے ہیں۔ جھوٹ ان کے لیے ایک نارمل چیز بن جاتا

ہے۔ قرآن مجید نے بنی اسرائیل کے بگاڑ کے دور کی ایک خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ سَمّٰعُونَ لِلْکَذِبِ اَکّٰلُونَ لِلسُّحتِ (جھوٹ سننے والے اور حرام کے مال کھانے والے ہیں۔سورہ مائدہ، آیت ۴۲) مبالغے کے صیغے میں سمّاع کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ جھوٹ کو جھوٹ سمجھ کر بھی آسانی سے قبول کر لیتے تھے اور اس کے عادی ہو چکے تھے۔ یہ کسی معاشرے کے اجتماعی ضمیر کی موت ہوتی ہے کہ وہ جھوٹ سننے اور قبول کرنے کا اس حد تک عادی ہو جائے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میڈیا کا اثر صرف اس بات تک محدود نہیں ہے کہ اب صحیح باتیں معلوم نہیں ہو رہی ہیں، یا کچھ قدریں پامال ہو رہی ہیں یا کسی معاملہ میں رائے عامہ غلط رخ پر تشکیل پا رہی ہے، بلکہ یہ پستی کی طرف لے جانے والے ایک مکمل تہذیبی انقلاب کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ صرف سوچ نہیں بدل رہا ہے بلکہ سوچنے اور دیکھنے کا زاویہ اور ذہن کا سانچہ بدل رہا ہے۔وجودیات (ontology) اور قدریات (axiology) کے پیمانے بدل رہا ہے۔ فرد اور سماج کی نفسیات اور لاشعور کو متاثر کر رہا ہے۔اس طرح میڈیا، صرف رائے عامہ پر نہیں بلکہ رائے عامہ کے پیراڈائم پر اثر انداز ہو رہا ہے۔

یہ مختصر جائزہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ رائے عامہ کی درست سمت میں تشکیل کے لیے میڈیا پر توجہ کس قدر ضروری ہے اور میڈیا پر درست توجہ کے لیے کس قدر گہرے شعور اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

سوشل میڈیا

سوشل میڈیا سے یہ توقع تھی کہ وہ اس صورت حال کو بدلے گا۔ سوشل میڈیا کئی پہلوؤں سے مین اسٹریم میڈیا سے بہت مختلف ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس پر سیاسی اور سرمایہ دارانہ طاقتوں کا ویسا کنٹرول نہیں تھا جیسا مین اسٹریم میڈیا پر تھا۔

آج سے تیس چالیس سال پہلے اہل اسلام کو شکوہ تھا کہ ماس میڈیا پر بڑے بڑے سرمایہ دار قابض ہیں۔ سرمایہ دارانہ استعمار ساری دنیا میں اسلام کو اپنے لیے رکاوٹ سمجھتا ہے۔ چنانچہ دنیا

ٹی وی کی اسکرین پر اسلام کے مخالفین کو ہی دیکھتی ہے۔ ریڈیو پر انھی کو سنتی ہے۔ اخباروں میں انھی کو پڑھتی ہے۔ اہل اسلام اگر کچھ سنانا اور پڑھانا چاہیں تو ان کے وسائل اس بیش قیمت میڈیا پر دسترس کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ آج سوشل میڈیا نے اس دیرینہ شکایت کو ختم کردیا ہے۔ اب وہ دور نہیں رہا جب دنیا میڈیا کے پروڈیوسروں اور صارفین میں بٹی ہوئی تھی، جب میڈیا میں بولنے والے کچھ وی آئی پی لوگ تھے اور باقی سب عوام اور سننے والے تھے، لکھنے والے کچھ نہایت بااثر لوگ یعنی نام ور مصنفین تھے اور باقی دنیا صرف پڑھنے والی تھی، جب چند لوگ معلومات تخلیق کرتے تھے اور باقی سب اس کا استعمال کرتے تھے۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا انسانوں کے بیچ اس ناہمواری کو دور کرنے والے (leveller) کے روپ میں سامنے آیا اور بظاہر اس نے یہ تفریقات مٹادیں۔ اب ہر انسان کے پاس میڈیا ہے۔ اب معلومات اور میڈیا مشتملات کے پروڈیوسر اور صارفین الگ الگ نہیں ہیں۔ ہر صارف میڈیا پروڈیوسر بن سکتا ہے۔ ایک گھریلو خاتون، گھر میں بیٹھے بیٹھے ایسی باتیں لکھ سکتی ہے جو ساری دنیا کو متوجہ کرسکیں۔ ایک اسکول کا بچہ، اپنے ٹیب کے ذریعے ایسا ویڈیو بنا سکتا ہے جو ساری دنیا میں ہنگامہ مچادے۔ طاقت ور لوگوں کی لاکھوں روپیوں کے صرفہ سے منعقد پریس کانفرنس سے زیادہ، ایک غریب آدمی کا مفت کا ٹویٹ لوگوں کی توجہات کا مرکز بن سکتا ہے۔ ایک لڑکی فیس بک پر پوسٹ کرکے، ایک بڑے انقلاب کا آغاز کرسکتی ہے۔ اس جہان نو میں ہر آدمی رپورٹر ہے اور ایڈیٹر بھی، اس طرح خبروں کی پہرے داری ممکن نہیں رہی۔ ہر آدمی تجزیہ نگار ہے اور اس کے تجزیے کی اشاعت روکنے والا کوئی نہیں، اس طرح خیالات و افکار پر قدغن لگانا آسان نہیں رہا۔

آج فیس بک کا استعمال کرنے والوں کی تعداد تقریباً ڈھائی بلین ہوچکی ہے۔ یعنی فیس بک اگر کوئی ملک ہوتا تو دنیا کا سب سے بڑا ملک ہوتا۔ بلاشبہ اس ذریعے سے انسانیت کے بہت بڑے حصے تک اپنی بات پہنچانا انتہائی آسان ہوگیا ہے۔ سوشل میڈیا نے بے آوازوں کو آواز بخشی ہے، اور یہ ممکن بنایا ہے کہ اگر پیغام میں طاقت اور کشش ہے تو وہ وسائل اور دولت کے سہارے کے بغیر محض اپنی اندرونی کشش اور طاقت کے بل پر پھیلے اور اثر انداز ہو۔ یہ اسلام اور اہل اسلام کے لیے

بہت بڑا موقع ہے۔ اہل اسلام کی اصل طاقت پیغام کی طاقت ہی ہے۔ اُن کے پاس خدا کا پیغام ہے جو اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ سوشل میڈیا نے اس اصل طاقت کو بروئے کار لانے کے مواقع کئی گنا بڑھا دیے ہیں اور امکانات کی ایک وسیع دنیا کے دروازے کھول دیے ہیں۔ اس کی وجہ سے بجا طور پر یہ امید کی جانے لگی تھی کہ اسلام کے حوالہ سے میڈیا کا منظر نامہ اب تیزی سے بدلے گا۔ لیکن ہم اگلی سطروں میں واضح کریں گے کہ یہ امید بوجوہ پوری نہیں ہوسکی۔ اور آج اسلام کے حوالہ سے میڈیا کا منظر نامہ پہلے سے کہیں زیادہ آلودہ ہے اور سنجیدہ توجہ کا متقاضی ہے۔

لیکن دھیرے دھیرے صورتِ حال بدلنے لگی۔ اب سوشل میڈیا پر بھی استحصالی اور استبدادی طاقتوں نے مختلف طریقوں سے کنٹرول حاصل کرنا شروع کر دیا ہے۔ سوچ کے پیراڈائم کی تبدیلی میں اب اہم کردار سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کا بھی ہے۔ مین اسٹریم میڈیا کے برخلاف یہاں میدان بہت زیادہ وسیع اور امکانات لا محدود ہیں۔ عام آدمی کے لیے بھی اور استحصالی طاقتوں کے لیے بھی۔ جھوٹی خبریں، بلکہ جھوٹی تصویریں اور ویڈیو بھی یہاں آسانی سے مقبول کیے جاسکتے ہیں۔ ادراک کی انجینئرنگ (perception engineering) اور ادراک کا انتظام (perception management) انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے اہم فنون ہیں۔ ماہرین فن اپنے گاہکوں کے تجارتی، سیاسی یا نظریاتی مقاصد کی خاطر لوگوں کے فہم وادراک پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی متعدد تکنیکیں ہیں اور یہ اب بڑا ترقی یافتہ فن بن چکا ہے۔

اسلام اور میڈیا، گذشتہ ربع صدی میں

اسلام کے خلاف میڈیا کی جنگ بہت پرانی ہے۔ اس موضوع پر بہت پہلے ایڈورڈ سعید نے اپنی چشم کشا کتاب[6] میں تفصیل سے تجزیہ کیا تھا کہ میڈیا کیسے ساری دنیا میں اسلام کے تعلق سے منفی رائے پیدا کر رہا ہے اور کیسے اسلام کے بارے میں دنیا کے کروڑوں انسانوں کے خیالات منصوبہ بند طریقے سے متاثر کیے جا رہے ہیں۔

سعید کی اس کتاب کے بعد دنیا کے حالات بہت بدل گئے اور اب اسلام پر میڈیا کی یہ

یلغار بہت تیز ہوگئی۔ تین دہوں قبل جب انٹرنیٹ کا آغاز ہوا تو یہ امید بندھی تھی کہ اس آزاد میڈیا پر اہلِ اسلام کی سرگرمی نسبتاً آسان اور زیادہ موثر ہوگی اور وہ خیالات اور افکار کو مثبت طور پر متاثر کرنے میں کام یاب بھی ہوں گے۔ ابتدا میں اس کے روشن آثار بھی نظر آنے لگے تھے۔ لیکن اس کے بعد بتدریج اسلام کی حامی مثبت اور معتدل آوازیں کم زور ہوتی چلی گئیں اور اسلام مخالف اور اسلاموفوبیا عناصر کا اسلام کے حوالے سے ہو رہے مباحث پر غلبہ بڑھتا گیا۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا بھی ساری دنیا میں اسلام کے تعلق سے منفی سوچ کو فروغ دینے کا اہم پلیٹ فارم بن چکا ہے۔[7] یہ کام کس بڑے پیمانے پر اور کس قدر منظم طریقے سے ہو رہا ہے، اس پر کئی اسٹڈیز ہو چکی ہیں۔[8] ان اسٹڈیز کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی اسلام دشمن طاقتیں بھی انھی خطوط پر آگے بڑھ رہی ہیں اور بڑے پیمانے پر اسلام کے مخالف رائے بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

اس کے مقابلے میں اہل اسلام کی سوشل میڈیا سرگرمی اول تو بہت کم اور ناکافی ہے اور جو کچھ ہے وہ زیادہ تر غیر سنجیدہ ہے۔ کم تعلیم یافتہ اور غیر تربیت یافتہ نوجوان بڑی تعداد میں بے مصرف کاموں میں مصروف ہیں۔ جو سنجیدہ سرگرمی ہے اس کا بڑا حصہ معذرت خواہانہ اور مدافعانہ مباحث پر مشتمل ہے۔ اب ایسے لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے جو اسلام پر چو طرفہ حملوں سے پریشان ہو کر معذرت خواہانہ اور مدافعانہ انداز اختیار کرنے لگے ہیں۔ اسلام کے بنیادی اصولوں پر سیریس مصالحت، حد سے زیادہ مرعوبیت اور مداہنت اس ردِ عمل کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کی مضحکہ خیز سطح کی معذرت خواہی، اسلام کے وقار کو مجروح کرتی ہے، اسلام مخالفین کے تاثر کو مستحکم کرتی ہے اور اسلام کی دعوت کے کام کو نقصان پہنچاتی ہے۔ انٹرنیٹ پر اب ایسے خیالات بہت جلد نمایاں ہو جاتے ہیں۔

دوسری طرف سوشل میڈیا پر وہ لوگ بھی اب بہت فعال ہیں جو اسلام کی نہایت انتہاپسندانہ تعبیر کرتے ہیں، غیر شرعی تشدد کی حمایت کرتے ہیں، مسلکی تعصب اور فقہی آرا میں عدم

برداشت کے رویے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ غیر مسلموں کے سلسلے میں ان کا رویہ نہایت جارحانہ ہوتا ہے۔ ڈائیلاگ کے بجائے ایسے مونولاگ میں یقین رکھتے ہیں جس میں مخاطب کی سوچ اور اس کے مزاج کے لحاظ کے بغیر اپنی بات جبر کے لہجے میں بیان کی جاتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ لوگ اسلام کی وہی ترجمانی کرتے ہیں جو اسلام کے دشمن چاہتے ہیں۔ یہ لوگ بھی بالآخر اسلام کی دعوت اور اس کی امیج کو نقصان ہی پہنچاتے ہیں اور بجائے رائے عامہ کو مثبت طور پر متاثر کرنے کے، منفی اثرات پھیلانے کا سبب بنتے ہیں، یعنی اسلام کے خلاف عوامی رائے کو اور زیادہ مستحکم کرتے ہیں۔

انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کا سرسری تجزیہ بھی یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ اسلام کی حمایت میں اٹھنے والی معقول، تعمیری، مبنی بر اعتدال اور اسلام کی صحیح ترجمانی کرنے والی آوازیں بہت کم ہیں اور مذکورہ بالا آوازوں کے انبوہ میں پوری طرح دبی ہوئی ہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں دنیا کے بعض ممالک میں اسلامی تحریکوں پر جو آزمائشیں آئی ہیں ان کا اثر انٹرنیٹ پر بھی پڑا ہے۔ اسلامی تحریکوں کی درجنوں ویب سائٹیں یا تو بند ہو چکی ہیں یا سست رفتار ہو گئی ہیں۔ یہ اس وقت اہل اسلام کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے جس کا بھرپور طریقے سے سامنا کرنے کی اور اس صورتِ حال کو جلد از جلد بدلنے کی کوشش ہم سب پر فرض ہے۔

مطلوب اقدامات

اس بحث سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کو رائے عامہ کی درست تربیت کا ذریعہ بنانا انتہائی ضروری لیکن بڑا چیلنجنگ کام ہے۔ اس کام میں خاصی تاخیر ہو چکی ہے۔ زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے اور ہم پیچھے رہ گئے ہیں۔ میڈیا کی جب بھی بات آتی ہے، لوگ چینل یا اخبار نکالنے کی بات شروع کر دیتے ہیں۔ اس حقیقت کے علاوہ کہ چینل یا کوئی بااثر اخبار شروع کرنا اور چلانا بڑا چیلنجنگ کام ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ کئی ضرورتوں میں سے محض ایک ضرورت ہے۔ بہت سے کام بہت آسانی سے فوری طور پر بھی شروع کیے جا سکتے ہیں اور ان کے ذریعے اثر بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔

- سب سے پہلی ضرورت افرادِ کار کی ہے۔ اس وقت میڈیا پر اثر اندازی کے لیے کئی طرح

کی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ اچھا لکھنے اور بولنے والے درکار ہیں۔ مختلف زبانوں میں مہارت رکھنے والے درکار ہیں۔صرف اچھا لکھنا اور بولنا کافی نہیں ہے۔ وہ ذہانت بھی درکار ہے جس کے ذریعے مناسب وقت پر مناسب بات مناسب پیرائے میں کہی جاسکے۔ سیدھی باتوں کے ساتھ بالواسطہ طریقوں سے بھی ذہن وخیال پر اثر انداز ہونے کا ہنر مطلوب ہے۔جدید میڈیا بات کہنے کے بھی کئی طریقے اور اصناف چاہتا ہے۔ لکھنے کے علاوہ بولنا، بولنے کے ساتھ ویڈیو، گرافکس، میم، وغیرہ ذرائع کا موثر استعمال کرنا، فلم، کارٹون، آرٹ، کامیڈی، ڈاکیومنٹری وغیرہ جیسی اصناف کو بروئے کار لانا، یہ سب لیاقتیں درکار ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان سب کے حوالے سے ہم بہت پیچھے ہو چکے ہیں۔ شدید ضرورت ہے کہ ان صلاحیتوں کے فروغ کی سنجیدہ کوشش کی جائے، ان صلاحیتوں کے حامل نوجوانوں کی ہمت افزائی کی جائے، انھیں آگے لایا جائے اور کوشش کی جائے کہ آئندہ چند برسوں میں میڈیا کو درکار متنوع صلاحیتوں کے حامل افراد کی ایک معقول تعداد ہماری صفوں میں موجود ہو۔

- سوشل میڈیا کے سلسلے میں امت کے ہر حلقے میں شور و غوغا تو بہت ہے لیکن سنجیدہ کام بہت کم ہیں۔ اس کام میں سنجیدگی اور گہرائی اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک امت کے ذمہ دار لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اور اِس ضرورت کا احساس اُن کے اندر نہیں پیدا ہوتا کہ انھیں اس میڈیم کا استعمال کر کے ملک کی عام آبادی سے بات چیت کرنی ہے۔ اب وہ دور نہیں رہا جب سوشل میڈیا محض نوجوانوں کا پلیٹ فارم ہوا کرتا تھا۔ دنیا بھر کے معمر، تجربہ کار قائدین، مصنفین اور دانش وران اور مصلحین و مذہبی رہ نما اب یہاں فعال اور سرگرم ہیں اور خیالات و افکار کی سنجیدہ کش مکش کے لیے بھی یہ میدانِ کارزار بن چکا ہے۔ لیکن دوسری طرف جب ہم اسلام کے داعیوں، علما اور ملی قائدین کی میڈیا اور سوشل میڈیا پر سرگرمی دیکھتے ہیں تو بہت ہی مایوس کن صورت حال سامنے آتی ہے۔ ٹوئٹر جو سنجیدہ مباحث اور رائے عامہ کی تشکیل کے لیے اہم ترین پلیٹ فارم مانا جاتا ہے، اس پر ہمارے ملک میں بزرگ مسلم رہ نماؤں کی سرگرمی تقریباً

صفر ہے۔نوجوان ضرور کوشش کررہے ہیں اور بعض لوگ بہت اچھی کوشش بھی کررہے ہیں،وہ ہمارے محسنین ہیں اور شکریے کے مستحق ہیں۔ لیکن جب تک وہ لوگ، جو وسیع حلقۂ اثر رکھتے ہیں اور لوگوں کے فکر و خیال پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں، سرگرم نہیں ہوں گے منظر نامہ نہیں بدلے گا اور اس محاذ پر سرگرم نوجوانوں کی درست اور متوازن رہ نمائی بھی نہیں ہو سکے گی۔

- ایک اہم مسئلہ سوشل میڈیا پر بحث و گفتگو کے انداز اور لب و لہجے کا ہے۔کمیونکیشن سائنس میں اب یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ بعض صورتوں میں گفتگو اور تبادلۂ خیال سے مخالف نقطۂ نظر بجائے بدلنے کے اور مستحکم ہوتا ہے۔ اسے سوشل سائیکولوجی کی اصطلاح میں 'رویہ کی تفریق' (attitude polarisation) کہتے ہیں۔ رویے کی تفریق یہ ہے کہ دو گروہ، متضاد خیالات میں شدت کے اعتبار سے اُس مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ ہر ایک ہر واقعے کی اپنی سوچ کے مطابق تاویل کرنے لگتا ہے اور دونوں گروہوں کے درمیان نہ صرف بامعنی ڈائیلاگ ناممکن ہونے لگتا ہے بلکہ ایک گروہ کی جانب سے پیش ہونے والا ہر استدلال، دوسرے گروہ کی مخالف رائے کو اور مستحکم کرتا ہے۔[۹] سی اے اے پر احتجاج ہوتا ہے تو سی اے اے کے مخالفین کی رائے مستحکم ہوتی ہے کہ سی اے اے غلط ہے اور جتنا احتجاج ہوتا جاتا ہے، اس کے حامیوں کی یہ رائے اور مستحکم ہوتی جاتی ہے کہ یہ عین ملک کے مفاد میں ہے۔اس وقت اسلام کے حوالے سے دنیا بھر میں یہی صورت حال ہے اور ہمارے ملک میں تو یہ صورت حال بے حد شدید ہے۔ اس لیے ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت فرقہ پرست قوتوں کی عین کوشش یہی ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ انتہاپسندانہ خیالات اور لب و لہجہ اختیار کریں۔ وہ جتنی شدت پسند زبان اختیار کریں گے، اتنا ہی ان کا فائدہ ہوگا۔ ایسے موقعوں پر شدید لب و لہجے سے جذبات کی تسکین ضرور ہوتی ہے، اپنے نقطۂ نظر کے حامیوں کی حمایت بھی حاصل ہو جاتی ہے، لیکن رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کا مقصد ہرگز حاصل نہیں ہوتا۔ اس مسئلے کا حل یہ نہیں ہے کہ مسلمان خاموش ہو جائیں یا معذرت خواہانہ اور مدافعانہ لب و لہجہ اختیار کریں،

بلکہ حل یہ ہے کہ وہ اس صورت حال کا شعور حاصل کریں اور مذاکرات کا وہ انداز اختیار کریں جو رویے کی تفریق کی اس کیفیت کے مناسبِ حال ہو۔ رویہ کی تفریق کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مذاکرات کا انداز کیا ہو، اس پر آئندہ کسی وقت ہم تفصیل سے لکھیں گے۔ اس وقت اس مسئلے کی طرف صرف متوجہ کرنا پیش نظر ہے۔

- ہمارے ملک میں سوچ اور خیال کا اور گروہی مفادات کا اس قدر تنوع ہے کہ ایک زبان اور ایک ڈسکورس پورے ملک کی رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کے لیے بالکل کافی نہیں ہے۔ کمیونکیشن سائنس میں یہ بحثیں موجود ہیں کہ اکیسویں صدی کے میڈیا کی اہم خصوصیت ڈی میسی فکیشن (demassification) ہے۔[۱۸] یعنی اب میڈیا سارے عوام کو ایک ساتھ مخاطب کرنے کے بجائے عوام کے مختلف طبقات کو الگ الگ مخاطب کرتا ہے۔

اس سمت میں گذشتہ چند برسوں میں میڈیا کے اپروچ میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں وہ ششدر کر دینے والی ہیں۔ پہلے ملک کے سارے عوام کو اکائی مان کر مخاطب کیا جاتا تھا، اسے براڈ کاسٹنگ (broadcasting) کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ دور شروع ہوا جس میں میڈیا نے نیرو کاسٹنگ (narrowcasting) پر توجہ دی یعنی عوام کو مختلف طبقات میں بانٹ کر ہر ایک کو الگ مخاطب کرنا۔ بچوں کو الگ، خواتین کو الگ، دیہاتیوں کو الگ، شہروں میں رہنے والوں کو الگ، ہر نقطۂ نظر اور مکتب خیال کے حاملین کو الگ، ہر ذات اور سماجی گروہ کو الگ۔ ایک ہی گروپ کے اخبارات میں انگریزی اخبار کی پالیسی الگ ہوتی ہے، ہندی کی الگ اور اردو کی الگ۔ اب میڈیا میں وہ عمل شروع ہوا ہے جسے کمیونکیشن سائنس دان 'انتہائی شخصی کاری' (hyperpersonalisation) کہتے ہیں۔ یعنی ایک ایک فرد کی مخصوص دل چسپیوں، رجحانات، خیالات وغیرہ کو سامنے رکھ کر اس کے لیے مخصوص میڈیا مواد اسے فراہم کرنا۔ نیگرو پونٹ نے بہت پہلے پیشین گوئی کی تھی کہ بہت جلد میڈیا ہر ایک کو 'میرا روزنامہ' (daily me) فراہم کرے گا۔[۱۹] یہ پیشن گوئی بہت آب و تاب کے ساتھ پوری ہو رہی ہے اور اندازہ ہے کہ مستقبل قریب میں، یعنی آگمینٹیڈ رئیلٹی کے آنے والے دور میں، یہ صورت حال بہت شدید ہو جائے گی۔

ایک طرف ہر فرد کو انفرادی طور پر مخاطب بنانے کی یہ صورت حال ہے اور دوسری طرف

ہمارے بولنے اور لکھنے والوں کے لیے اپنے سوا سارا ملک یا تو 'ہندو' ہے یا 'برادرانِ وطن' کا واحد اور یک رنگ زمرہ۔ اب زیادہ سے زیادہ فرق پیدا ہوا ہے تو سنگھی اور غیر سنگھی کا فرق ہے۔ دائیں بازو کا رجحان رکھنے والوں میں بھی خیال و فکر کی اور شدت پسندی کی مختلف سطحیں ہیں۔ اسی طرح سیکولر کہلائے جانے والوں میں بھی سوچ کی کئی دھارائیں پائی جاتی ہیں اور پھر دلتوں، آدی باسیوں، اور دیگر پس ماندہ ذاتوں کے بے شمار طبقات ہیں جن میں خیالات کے بڑے فرق پائے جاتے ہیں۔ اس حقیقت کے بھرپور ادراک کے بغیر نہ مناسب میڈیا اسٹریٹجی بن سکتی ہے اور نہ رائے عامہ کو متاثر کرنے میں ہم کام یاب ہو سکتے ہیں۔ خود اسلامی تحریکوں کے کارکنوں میں بھی یہ صورت حال دیکھنے کو ملتی ہے کہ وہ فرق نہیں کر پاتے کہ کون سی بات کہاں کہنے کی ہے۔ تنظیمی اجلاسوں کی تقریروں کو بھی پورے جوش کے ساتھ سوشل میڈیا پر عام کر دیا جاتا ہے۔ یہ نیرو کاسٹنگ کے مطلوب شعور کی واضح کمی کی علامت ہے۔

نیرو کاسٹنگ اور ہائپر پرسنلائزیشن کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم مخاطب کے خیالات کا ہی نہیں بلکہ اس کے جذبات کا بھی گہرا شعور حاصل کریں۔ اس کے دماغ سے سوچنے کی صلاحیت پیدا کریں۔ مختلف طبقات اور ان کے افکار و خیالات کا گہرا مطالعہ، اُن کی تاریخ، اُن کے اعتقادات، اُن کے رسوم، اُن کی سماجی صورت حال، ماضی قریب کی اُن کی سماجی و سیاسی تحریکات، اس وقت ان کی سیاسی، سماجی، روحانی اور تہذیبی وابستگیاں جیسے امور کا گہرا مطالعہ درکار ہے۔ اس وقت سوشل میڈیا کے تبصرے اور مباحث بھی ان باتوں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اگر اپنی پوسٹوں پر ہو رہے مباحث کو بھی ہم سنجیدگی سے پڑھیں، تبصرہ کرنے والوں کی درجہ بندی کر کے اس سے ان کے خیالات و جذبات کو جوڑیں تو اس مسلسل مشق سے بھی اپنے مخاطبین کے بارے میں ہمارا شعور پختہ ہوگا۔

(زندگی نو، مارچ ۲۰۲۰)

حواشی و حوالہ جات

ا۔ John Peddie, Augmented Reality: Where We Will All Live?, Springer, CA USA, 2017, pages 128-140.

۲۔ ان اثرات کو سمجھنے کے لیے دیکھیے ایک نہایت دل چسپ کتاب:
Mel Slater et. al (edited), *The Impact of Virtual and Augmented Reality on Individuals and Society*, Frontiers Media, October 2019

یہ کتاب سائیکلوجی کے جرنل Frontiers in Psychology کے کچھ نہایت چونکا دینے والے مضامین کا مجموعہ ہے۔

۳۔ Edward S. Herman and Noam Chomsky,Manufacturing Consent:The Political Economy of the Mass Media, Pantheon Books,2002, page 302

۴۔ اس تفصیل کے لیے مطالعہ فرمایئے کتاب محولہ تحت ۳

۵۔ مثلاً
Dorota Probucka, *Truth and lies in journalism: A dispute concerning the accurate presentation of information*, in Ethics & Bioethics (in Central Europe), 2018, 8 (1–2), 81–89

۶۔ Said, Edward W. Covering Islam: How the media and the experts determine how we see the rest of the world (2nd Edition). Random House, 1997.

۷۔ Chao, En-Chieh. "The-Truth-About-Islam.Com: ordinary theories of racism and cyber Islamophobia." Critical Sociology 41, no. 1 (2015) : 57-75.

۸۔ Ekman, Mattias. (2015). Online Islamophobia and the politics of fear: manufacturing the green scare. Ethnic and Racial Studies. 38. 1-17.

۹۔ Juan Dubra & Jean Pierre Benoit, Attitude Polarisation: Theory and Evidence, Documentos de Trabajo/Working Papers 1503, Facultad de Ciencias Empresariales y Economia. Universidad de Montevideo, 2015.

۱۰۔ Chaffee, S. H., and Metzger, M. J. 2001. The end of mass communication? Mass Communication and Society, 4 (4) : 365–379.

۱۱۔ Negroponte, N, Being digital, Knopf, New York:1995.

مابعد کووڈ منظر نامہ اور اسلامی دعوت

اس وقت جہاں کووڈ ۱۹ کی تباہ کاریوں اور اس سے مقابلہ کی تدابیر پر ساری دنیا میں بحث وگفتگو ہو رہی ہے وہیں گفتگو کا ایک اہم موضوع مابعد کووڈ کی صورت حال ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کووڈ کے بعد کی دنیا ایک بالکل مختلف دنیا ہوگی، بساط عالم پر بہت کچھ اتھل پتھل ہوگی، افکار ونظریات کی توڑ پھوڑ ہوگی، سوچ کے دھارے بدلیں گے، فکری نظاموں کی بنیادیں متزلزل ہوں گی، تہذیبیں کروٹیں لیں گی، تمدن کی نئی صورت گری ہوگی، نئی قوتیں ابھریں گی، نئے رجحانات فروغ پائیں گے اور زندگی کے بالکل نئے اور اچھوتے طرز عام ہوں گے۔

تہذیبوں کا سفر دراصل مصیبتوں کی خاکستر سے بھڑک اٹھنے والی چنگاریوں کا سفر ہے۔ انسانی تاریخ کے کئی فیصلہ کن پڑاؤ قیامت خیز طوفانوں کے مرہون منت ہیں۔ ایسے طوفان جب گزر جاتے ہیں تو سب کچھ تلپٹ ہو چکا ہوتا ہے۔ پھر تہذیب وتمدن کی نئی تعمیر شروع ہوتی ہے۔ تہذیب کی تعمیر میں ہمیشہ اینٹ اور گارے کا کام افکار وخیالات کرتے ہیں۔ اس لیے تعمیر نو کے لیے نئے خیالات اور افکار کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس وقت بھی، یعنی کووڈ ۱۹ کے بعد بھی، گوناگوں مسائل کا ایک انبوہ انسانی صلاحیتوں کے امتحان کے لیے تیار ہے۔ ان مسائل کے حل کے لیے نت نئے خیالات اور آئیڈیاز کا سیلاب آئے گا اور اس طوفان اور ہنگامے کے بطن سے یقیناً ایک نئی دنیا جنم لے گی۔

سابقہ عالمی وبائیں اور ان کے اثرات

اس عالمی وبا کے بعد کیا کچھ ہوگا؟ اور دنیا پر اس کے اثرات کتنے گہرے ہوں گے؟ اس کو سمجھنے کے لیے سابقہ وباؤں پر ایک نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔ معلوم تاریخ کی ایک تباہ کن عالمی وبا جس

نے انسانی زندگی پر نہایت گہرے اثرات ڈالے، طاعون کی وہ وبا تھی جو چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں (۱۳۴۷ء تا ۱۳۵۰ء) یورپ میں پھیلی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں یورپ کی آبادی کا تہائی سے آدھے کے درمیان حصہ موت کا شکار ہوگیا۔ بعض شہروں اور قصبات میں تو اسی پچاسی فی صد لوگ موت کا نوالہ بن گئے۔ اس نے یورپ کی زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا۔ مزدوروں کی تعداد میں بھاری کمی آگئی اور زمین داروں کو اپنی زمینوں کی کاشت کے لیے مزدوروں کے لالے پڑ گئے۔ اس صورت حال نے زمین داری نظام کی بنیادیں ہلادیں، صنعت وحرفت کے نئے طریقوں کی کھوج شروع ہوئی، مشینوں کے فروغ کی راہ ہم وار ہوئی اور اس صورت حال نے صنعتی انقلاب کی نیو ڈالی۔ قدیم توہم پرستانہ طریقہ ہائے علاج، جن کا یورپ میں رواج تھا، بری طرح عوامی اعتماد سے محروم ہوگئے۔ بو علی سینا جیسے مسلمان اطبا کے نظریاتِ طب کی یورپ میں گونج شروع ہوئی اور اس نے جدید میڈیکل سائنس کے انقلاب کی راہ ہم وار کی۔ کلیسا کے رجعت پسندانہ اور نامعقول تصورات کے خلاف شدید بغاوت پیدا ہوئی جس کے نتیجہ میں ایک طرف پروٹسٹنٹ تحریک جیسی مذہبی اصلاح کی تحریک بپا ہوئی اور دوسری طرف کلیسا اور مذہب کے رول کو محدود کرنے والی جدید سیکولر تحریکات کا آغاز ہوا۔ مورخین کی ایک بڑی جماعت یہ یقین رکھتی ہے کہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ اور جدیدیت کی تحریک میں چودھویں صدی کی وبا کے پیدا کردہ حالات کا بڑا دخل ہے۔

اسی طرح سو سال پہلے ۱۹۱۹-۲۰ میں ایک بھیانک عالمی وبا پھیلی تھی جسے انفلوئنزا کی وبا یا اسپینی فلو کی وبا کہا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں پانچ سے دس کروڑ لوگ ہلاک ہوئے، یعنی اس وقت کی عالمی آبادی کا ڈھائی سے پانچ فی صد حصہ موت کا شکار ہوگیا۔ اس وبا نے زیادہ تر جوان مردوں کو (بیس سے چالیس سال کی عمر کے) متاثر کیا۔ کمانے والے افراد کی ایک بڑی تعداد اس کی شکار ہوئی۔[14] اس وبا نے پہلی عالمی جنگ کے نتیجہ کو متاثر کیا۔ اٹلی اور جرمنی میں فسطائی اور نازی تحریکوں کے فروغ کے لیے ماحول کو سازگار بنایا، میڈیکل سائنس میں بہت سی ترقیوں کے لیے مہمیز فراہم کی اور لیگ آف نیشنز ہیلتھ آرگنائزیشن کی صورت میں صحت عامہ کے سلسلے میں عالمی تال میل کے دور کا آغاز ہوا۔

کووڈ۱۹ کے نتیجہ میں انسانی زندگی کے مختلف شعبے جس اتھل پتھل اور تبدیلی کے عمل سے گزر رہے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے اس تاریخی حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ عالمی وبائیں انسانی زندگی پر نہایت گہرے اثرات ڈالتی ہیں اور ایک نئی دنیا کو جنم دیتی ہیں۔ نئی دنیا کے جنم لینے کا یہ عمل آسان عمل نہیں ہوتا۔ امکان یہی ہے کہ مختلف افکار و نظریات، شدید کش مکش سے گزریں گے۔ دنیا کی جن ظالم قوتوں نے اس زمین کو جہنم بنا رکھا ہے، وہ اس صورت حال کا بھی استحصال کرنے کی کوشش کریں گی۔ اہل اسلام کو ان حالات میں سرگرم رول ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ کوشش ہونی چاہیے کہ اس وبا کے بعد ایک بہتر دنیا تشکیل پائے۔ تمدن کی نئی صورت گری اور تہذیب کی تشکیل نو کا عمل اس کائنات کے خالق و مالک کی مرضی اور اس کے احکام کے مطابق ہو۔ اور ایک پاکیزہ تر، زیادہ منصفانہ، زیادہ انسان دوست، زیادہ بااخلاق، زیادہ ذمہ دار، اور سب سے بڑھ کر خدا ترس عالمی معاشرے کی طرف ہم بڑھ سکیں۔

مابعد کووڈ صورت حال، زیر بحث امکانات

کووڈ۱۹ کے بعد کی دنیا کیسی ہوگی؟ اس کے بارے میں بہت سی باتیں کہی جارہی ہیں۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ یہ دور شدید معاشی بحران کا دور ہوگا۔ یہ معاشی بحران کتنا طویل ہوگا، اس کے بارے میں الگ الگ رائیں ہیں لیکن کم از کم مختصر وقفے یعنی ایک دو سال کے لیے پوری دنیا اور دنیا کے عوام کو طرح طرح کی معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ معاشی بحرانوں کا سب سے زیادہ اثر غریب عوام پر پڑتا ہے۔ اندیشہ یہ ہے کہ غربت، بھک مری اور فاقہ کشی بڑھے گی۔ یہ مسائل ہمیشہ انقلابات اور تبدیلیوں کے لیے زرخیز زمین فراہم کرتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ان احوال کے بطن سے کس طرح کے انقلابات جنم لیں گے۔

جدید لبرل سرمایہ دارانہ فکر، اپنی تاریخ کے سب سے بڑے بحران سے گزرے گی۔ ممالک زیادہ منضبط معیشت کی طرف بڑھیں گے۔ آزاد تجارت مشکل سے مشکل تر ہوتی جائے گی۔ ڈبلیو ٹی او اور اس کے عالمی معاہدے پہلے ہی مشکلات سے گزر رہے تھے، اب اُن کا مستقبل اور

مخدوش ہو جائے گا۔ حکومتوں کی مداخلت بڑھ جائے گی۔ بعض حکومتیں ان حالات میں لاک ڈاؤن وغیرہ کے ذریعے عوام کی آزادیوں کو محدود کرنے کا جو تجربہ کر چکی ہیں، اسے آگے بڑھا سکتی ہیں۔ وہ ترقی یافتہ ٹکنالوجی کے ذریعے عوام کی نگرانی، ان کے حقوق کی تحدید اور طرح طرح کی بندشوں کو عائد کرنے کی کوشش کر سکتی ہیں۔

یہ ان باتوں کا خلاصہ ہے جو عام طور پر کہی جا رہی ہیں۔ ان سے زیادہ تعرض کیے بغیر ہم ان امور کی طرف بڑھتے ہیں جنھیں ہمارے خیال میں، اہل اسلام کا ہدف ہونا چاہیے۔ اور جن کے سلسلے میں سنجیدہ کوشش کی جانی چاہیے۔ اگر سنجیدہ کوششیں کی جائیں اور اللہ کی تائید شامل حال رہے تو ان تبدیلیوں کے بھی خاصے مواقع یہ حالات فراہم کرتے ہیں۔

خدا مرکوز تصور جہاں (theistic worldview) کی طرف

سب سے اہم اور بنیادی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ دنیا خدا کے بارے میں زیادہ سنجیدہ ہو جائے اور خدا بیزار ورلڈ ویو سے خدا پر مرکوز ورلڈ ویو کی طرف اس کا رخ بدلے۔ اکیسویں صدی کا یہ دوسرا دہا، انسانی ترقیوں کے عروج کا زمانہ رہا ہے۔ انسانی زندگی اور انسانی تمدن کا حسن و جمال اور سحر انگیزی و کرشمہ سازی حیرت انگیز بلندیوں کو چھونے لگی۔ جو آسائشیں اور سہولتیں آج کے عام انسان کو میسر آئیں وہ گذشتہ زمانوں کے طاقت ور ترین بادشاہوں کو بھی میسر نہیں تھیں۔ ان تحقیقات پر جدید انسان کو بہت غرور تھا۔ لوگ اسے فطرت پر انسان کی فتح سمجھنے لگے۔ علم و فن کے اس غرور نے وہ نفسیات پیدا کی جس نے مذہب اور خدا سے انسان کو غافل کر دیا۔ اکیسویں صدی کے فرد کے لیے بھی اور قوموں کے لیے بھی، مادی ترقی ہی منزل بن گئی۔ ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا اور جہد و عمل کا واحد محور و مرکز یہ قرار پایا کہ کیسے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کی جائے۔ اس وبا نے اس انسانی غرور کو چکنا چور کر دیا ہے۔ اسے بتا دیا ہے کہ اس کی ساری ترقیوں کی خدا کی بے پناہ طاقت و قدرت کے سامنے کیا حیثیت ہے؟ يَأَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَن يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِن يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ

شَيۡـًٔا لَّا يَسۡتَنقِذُوهُ مِنۡهُ ضَعُفَ ٱلطَّالِبُ وَٱلۡمَطۡلُوبُ (لوگو، ایک مثال دی جاتی ہے، غور سے سنو جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے مدد چاہنے والے بھی کم زور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کم زور۔ الحج: ۲۳:۷)

اس آیت میں بنیادی طور پر جھوٹے خداؤں کی بے بسی کی طرف اشارہ ہے۔ ہمارے دور کے انسان نے، کچھ اور نئے خدا تخلیق کر لیے تھے۔ اپنے علم وفن اور اپنی تمدنی طاقت کو لاشعوری طور پر خدا سمجھنے کی غلطی کی تھی۔ ایک چھوٹے سے وائرس کے ذریعے یہ بتا دیا گیا کہ انسانی علم و فن کی کیا حیثیت ہے۔ اللہ کا حکم ہو تو اس کی مخلوقات میں سے ادنی ترین مخلوق، ایک نظر نہ آنے والا وائرس، پورے عالم انسانیت کو بے بس کر کے رکھ سکتا ہے۔ بڑی بڑی کمپنیاں، تعلیمی و تحقیقی ادارے، جگمگاتے شاپنگ مال، پر رونق تفریح گاہیں، عالی شان ایر پورٹ، پر تعیش ہوٹل، یہ سب ایک ساتھ، ربِّ کائنات کے ایک ہلکے سے اشارے پر بے جان کھنڈروں میں بدل سکتے ہیں۔ نوکروں کی فوج، خدا کے حکم سے اچانک ہمارے کنٹرول سے باہر ہو سکتی ہے۔ گھر بیٹھے آن لائن آرڈر دے کر من پسند چیزیں منگانے کی سہولت، گاڑی طلب کرنے کی سہولت اور دیگر بہت سی سہولتیں جو انسانی اختراع و ایجاد کا کرشمہ سمجھی جاتی ہیں، اچانک معطل ہو سکتی ہیں۔ اور بڑے سے بڑے آدمی کو اذیت، تنہائی اور بے بسی کا عذاب جھیلنا پڑ سکتا ہے۔

اس وقت ساری دنیا میں خدا کی طرف واپسی اور روحانیت اور روحانی قدروں کے احیا کا رجحان نظر آرہا ہے۔ یہ انسانی فطرت بھی ہے۔ قُلۡ أَرَءَيۡتَكُمۡ إِنۡ أَتَىٰكُمۡ عَذَابُ ٱللَّهِ أَوۡ أَتَتۡكُمُ ٱلسَّاعَةُ أَغَيۡرَ ٱللَّهِ تَدۡعُونَ (ان سے کہو، ذرا غور کر کے بتاؤ، اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے کوئی بڑی مصیبت آجاتی ہے یا آخری گھڑی آ پہنچتی ہے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ سورہ انعام، آیت ۴۰) اسلام کے داعیوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس موقع پر انسانیت کو خدا کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کریں۔

ان حالات میں، پوری قوت سے دنیا کو یہ بات سمجھانے کی ضرورت ہے کہ انسان کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کو نظر انداز کر کے خوش نہیں رہ سکتا۔ ان حالات کا اصل سبق یہی ہے کہ ہم سب اپنے پیدا کرنے والے کی طرف پلٹیں۔ اُس کی مرضی کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اُس کے اشاروں کو سمجھیں، اس کی وارننگ کو سمجھیں۔ اس معاملہ میں سنجیدہ ہوں۔ یہ موقع إِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ کی صدا بلند کرنے کا ہے۔ فَفِرُّوٓا إِلَى اللَّهِ إِنِّي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ کی دعوت پورے زور وشور سے اٹھانے کا موقع ہے۔

سائنس اور علوم کے بارے میں صحیح نقطہ نظر

انسان جب خدا کے حکم اور اس کی تعلیمات سے غافل ہو جاتا ہے تو بے اعتدالی اور انتہا پسندی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی سنت کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں، ٹھوس سائنسی حقائق کو خاطر میں نہیں لانا چاہتے اور اسباب سے بے نیاز ہو کر صرف دعاؤں اور عبادتوں سے ہر بلا کو ٹالنا چاہتے ہیں۔ اس طرز فکر کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وقت کے رسول نے بھی اپنے مرض کا علاج کرایا، اپنے وقت کے معروف ذرائع اور اسباب اختیار کیے، احتیاطی تدبیروں کا حکم دیا، جنگوں میں جاسوسی کا نظام، بہترین وسائل کی فراہمی کی کوشش، فوج کی تنظیم، تربیت غرض وہ سارے طریقے اختیار کیے جنھیں کام یابی کے دنیوی اسباب سمجھا جاتا ہے اور ہر طرح کی تیاری کرنے کے بعد خدا سے لو لگائی، اس سے دعائیں کیں اور اس سے مدد مانگی۔ اسی طرح وباؤں کی روک تھام کے لیے اپنے زمانے کی تمام معلوم تدبیریں اختیار کیں۔ یہی اسلام کی تعلیم اور اس کا فلسفہ ہے۔ اسلام عقل اور سائنس سے بے نیازی نہیں سکھاتا۔ اس پر توجہ دینے، عقل کو استعمال کرنے اور اسباب کو بروئے کار لانے کا حکم دیتا ہے۔

لیکن دوسری طرف انتہا یہ ہے کہ لوگ اسباب، سائنس اور علوم وفنون کو ہی سب کچھ سمجھنے لگتے ہیں، اپنے تمدنی وسائل کو خدا بنا لیتے ہیں، ان کی طاقت کے ایسے اسیر ہو جاتے ہیں کہ خدا سے بے نیاز ہو جاتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ اسباب کی قوت ان کے پاس ہے تو اب انھیں کسی چیز کی ضرورت

نہیں۔ یہ غرور اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ دور جدید کے خدا بیزار طرز فکر کی بنیاد انسانوں کا یہ غرور ہی ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی مادہ پرستی نے یہ بھرم پیدا کیا کہ ہم نے فطرت کے سارے حقائق کو جان لیا ہے، بس تھوڑا بہت جاننا باقی ہے، وہ بھی جان لیں گے اور فطرت اور اس کی ساری قوتوں کو مسخر کر لیں گے۔

۱۹۴۸ میں امریکی وزیر خارجہ جارج مارشل نے اعلان کیا تھا کہ ہم کرہ ارض سے متعدی امراض کا بہت جلد مکمل خاتمہ کر دیں گے۔ ۱۹۶۹ میں امریکی سرجن جنرل ولیم اسٹیوارٹ نے کانگریس میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ "اب وقت آ گیا ہے کہ متعدی امراض سے متعلق تمام کتابیں بند کر دی جائیں" اور یہ کہ "وباؤں کے خلاف جنگ اب ہم جیت چکے ہیں" سب سے زیادہ دل چسپ عالمی سطح پر سائنس دانوں کی وہ پیشین گوئی ہے جو ۱۹۹۰ میں کی گئی تھی۔ جسے ڈیلفی پیشین گوئی برائے صحت ۱۹۹۰ (Delphi Health Forecast) کہا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے ماہر سائنس دانوں کی جماعت نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا تھا کہ ۲۰۲۰ تک دنیا سے مرض کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یعنی بیماریاں باقی نہیں رہیں گی۔[۲] خدا کی قدرت دیکھیے کہ اسی ۲۰۲۰ کو انسانی تاریخ کی سب سے بھیانک وبا کے لیے منتخب کیا گیا۔

یہ دو انتہائیں ہیں جن کا عالم انسانیت شکار ہے۔ ایک طرف توہم پرستی اور پراسراریت ہے تو دوسری طرف ظاہر پرستی اور کائنات کی سب سے بڑی حقیقت یعنی رب کائنات سے مغرورانہ بے نیازی ہے۔

اسلام کی راہ اعتدال یہ ہے کہ ہم اسباب کو بھرپور طریقے سے استعمال کریں۔ جو کچھ علم اور عقل اللہ نے ہم کو دی ہے اس کو روبہ کار لائیں اور پھر اللہ سے بھی لو لگائیں۔ ہماری نظر کسی بھی واقعہ یا حادثہ کے سائنسی و عقلی پہلو پر بھی ہو اور روحانی یا فوق الطبعی پہلو پر بھی ہو۔ ہماری توجہات مسئلہ کو جدید تحقیقات اور اسباب و وسائل کے ذریعے حل کرنے پر بھی ہوں اور خدا سے مدد مانگ کر، اپنی غلطیوں کا جائزہ لے کر، اپنے گناہوں کی معافی مانگ کر خدا کی رحمت کو متوجہ کرنے پر بھی

ہو۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ بڑی سے بڑی طاقت اللہ کے سامنے بے بس ہے۔ فطرت کی ساری قوتیں اور سارے قوانین اللہ کی مرضی کے تابع ہیں۔ اسلام کا تصور علم یہ ہے کہ یہ ہماری وسیع و عریض کائنات، اس میں پایا جانے والا محیر العقول توازن اور اس کے جملہ قوانین ایک سب سے بڑی حقیقت یعنی باری تعالیٰ کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔ ہماری کائنات کا آخری حوالہ مادہ یا توانائی یا قوانین فطرت نہیں بلکہ خالق کائنات کا وجود ہے۔

اس لیے اصل رشتہ و تعلق تو اللہ تعالیٰ سے یعنی سارے انسانوں کے خالق و مالک سے ہونا چاہیے۔ لیکن خود اللہ نے اس کائنات کو چلانے کے لیے کچھ قوانین بنائے ہیں۔ اللہ کی اس سنت کا یعنی قوانین فطرت کا لحاظ رکھنے اور اسباب کو استعمال کرنے کا خود اللہ نے حکم دیا ہے۔

یہی اسلام کا مزاج ہے۔ اس وقت دنیا کو اسی اعتدال کی ضرورت ہے۔ اس وقت کی عالمی صورت حال اسلام کے اس معتدل نقطہ نظر کی عملی شہادت کا بہترین موقع فراہم کرتی ہے۔

سوشل کیپیٹل، تکریم انسانیت اور تعاون باہمی

جدیدیت نے انسانیت کو جن لعنتوں کا شکار کیا ان میں ایک اہم لعنت حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت پسندی (individualism) ہے۔ فرد کی آزادی اور ریاستی جبر کے خلاف مزاحمت سے شروع ہوکر بات اس قدر آگے بڑھ گئی کہ فرد کی اجتماعی ذمہ داریوں کا تصور دھندلا گیا اور ہر طرح کی اخلاقی و سماجی بندش، فرد کی آزادی کے خلاف سمجھی جانے لگی۔ اس وقت امریکہ اور بعض یورپی ملکوں میں ماسک کے خلاف تحریکیں اسی بنیاد پر چلائی جارہی ہیں کہ اس کا لزوم فرد کی آزادی کے خلاف ہے۔

دوسری طرف یہ انتہا بھی ہے کہ ریاست کا ادارہ کئی جدید ریاستوں میں اتنا ہمہ گیر، استبدادی بلکہ مقدس بنتا گیا کہ اس نے خدا کی جگہ لے لی اور خود ایک سیکولر خدا بن بیٹھا۔

اسلام نے فرد اور اجتماع کے درمیان توازن اور اعتدال کی راہ دکھائی ہے۔ فرد کو آزادی، تکریم اور حقوق بھی بخشے ہیں۔ اس کی پرائیویسی کا بھرپور احترام بھی کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس

کے اندر اپنی ذمہ داریوں کا شعور بھی پیدا کیا ہے۔ وہ اپنے خاندان، اپنے پاس پڑوس، اپنے سماج اور اپنے خالق و مالک کے تئیں ذمہ داریاں رکھتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر ان کے لیے اس کو اپنی آزادی کی، اپنے مفاد کی بلکہ اپنی جان کی بھی قربانی دینی پڑ سکتی ہے۔

وبا نے ایک طرف نفسا نفسی اور خود غرضی کی ایسی کیفیت پیدا کی کہ مرنے والے کی آخری رسومات کے لیے اس کے گھر والے تک تیار نہیں۔ دوسری طرف دنیا نے یہ منظر بھی دیکھا کہ پوری دنیا میں اسلام کے ماننے والوں نے اپنی جانوں کو خطروں میں ڈال کر دوسروں کی جانیں بچانے کی بھی کوشش کی، بھوکوں، مجبوروں اور مفلسوں کی ضروریات کی تکمیل کا سامان بھی کیا اور مرنے والوں کو احترام کے ساتھ ان کی آخری منزل تک پہنچانے میں بھی اپنا کردار ادا کیا۔ اہل اسلام کا یہ کردار الحمد للہ ساری دنیا میں نمایاں ہوا ہے۔ مسلمان ڈاکٹروں سے لے کر سماجی کارکنوں تک بلکہ عام مسلم مرد و خواتین تک، ہر طبقہ نے ایک امتیازی اور جداگانہ کردار اور مزاج کا مظاہرہ کیا جو انسان دوستی، دوسرے انسانوں کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کے شعور اور اپنے ذاتی مفاد پر سماج کی اجتماعی ضرورتوں کو ترجیح دینے کے جذبے کا مظہر تھا۔ یہ یقیناً اسلام کی تعلیمات کا نتیجہ تھا۔

اس وبا نے یہ بہت بڑی حقیقت دنیا کو سمجھائی ہے کہ اس دنیا میں سات بلین انسانوں کی زندگیاں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ ہم سب انسان ایک ماں اور ایک باپ کی اولاد ہیں۔ ہمارا مفاد مشترک ہے۔ ایک بیمار آدمی بھی، چاہے وہ غریب ہو یا امیر، ہماری ذات یا مذہب کا ہو یا کسی اور کا، اگر وہ بیمار ہے تو اس کی بیماری صرف اس کے لیے نہیں ہم سب کے لیے خطرہ ہے۔ قرآن نے کہا ہے وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا۔ (جس نے ایک انسان کی جان بچائی اس نے گویا ساری انسانیت کو زندگی بخشی۔ سورہ مائدہ، آیت ۳۲) اس بیماری نے ہم کو یہ عظیم حقیقت یاد دلائی ہے۔ چوں کہ بیماری تیزی سے دن بدن اور ساعت بہ ساعت پھیلتی ہے اس لیے ہم نے اسے محسوس کیا اور متوجہ ہو گئے۔ سماج کے غریب ترین انسان کو بھی بچانے کی فکر شروع کر دی۔ قوم، ذات، ملک کسی چیز کا تعصب حائل نہیں ہوا۔ کاش ہم یہ سمجھیں کہ اسی طرح

زندگی کے دوسرے پہلو بھی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ آبادی کے ایک بڑے حصہ کو مفلوک الحال اور پریشان حال رکھ کر ہم زیادہ دن خوشحال نہیں رہ سکتے۔ کچھ لوگوں کو مظلومیت اور تعذیب کی بھٹی میں دھکیل کر ہم ہمیشہ سکون کی بانسری نہیں بجاسکتے۔ انسانوں کی بقاکا انحصار اس بات پر ہے کہ امن وسکون سارے انسانوں کو میسر آئے۔ سب کی ضرورتیں پوری ہوں۔ سب کے حقوق کا تحفظ ہو۔ سب کو آزادی اور عزت ملے۔

آنے والے مہینوں میں یہ بحث تیز ہوگی کہ وبا کی روک تھام میں حکومتوں کے ماڈلوں نے کیارول ادا کیاہے۔ چین کی کام یابی کی وجہ بعض لوگ سخت گیر ریاستی ڈھانچہ کو سمجھتے ہیں لیکن چین سے کہیں زیادہ کام یاب نیوزی لینڈ، ڈنمارک، جرمنی، تایوان جیسے ممالک ہیں جہاں جمہوری حکومتیں ہیں۔ اصل مسئلہ جمہوری یا غیر جمہوری حکومت کا نہیں، بلکہ جن ملکوں میں حکومتوں کا رویہ عوام دوست رہاہے، عوام کا اپنی حکومتوں پر اعتماد رہاہے، عوام کے مختلف طبقات میں بہتر تال میل رہا ہے یاجدید سماجیاتی اصطلاح میں جہاں کا سوشل کیپیٹل اچھا رہاہے وہاں اس وبا کا مقابلہ آسان رہاہے۔

ان حالات میں انسانی تکریم، سماجی ذمہ داریوں، اور انسانوں کے درمیان انسانی بنیادوں پر بہتر تعلقات سے متعلق اسلام کی تعلیمات دنیا کو آسانی سے سمجھائی جاسکتی ہیں۔

معاشی عدل

سارے مالی وسائل رکھنے کے باوجود آج دنیا کی معیشت جام ہوچکی ہے۔ اور بھیانک معاشی بحران ہمارے دروازوں پر دستک دے رہاہے۔ ہمارے اس دور کی یہ خصوصیت ہے کہ کرونی کیپٹلزم کے نتیجے میں، معاشی نابرابری عروج کو پہنچ چکی ہے۔ تاریخ میں پہلی دفعہ ایسی صورت حال پیدا ہوگئی ہے کہ دنیا کی دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ گذشتہ چالیس برسوں میں صرف صفر اعشاریہ ایک فی صد لوگوں نے آدھی انسانیت سے زیادہ دولت پر قبضہ کیاہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ غریب کا غریب تر ہوتا جانا اور امیر کا امیر تر ہوتا جانا ہمارے دور کی نمایاں خصوصیت بن چکی ہے۔ ساری دنیا میں ایسی پالیسیاں اختیار کی جارہی ہیں کہ غریب کے منھ سے اس کے دونوالے بھی

چھین کر امیر ترین لوگوں کے خزانوں میں اضافہ کا ذریعہ بنایا جائے۔ آج کروڑوں لوگ بھوک پیاس سے بے حال ہیں۔ خود وبا کی اس سنگین صورت حال کے دوران ہمارے ملک سمیت، دنیا کے اکثر ترقی پذیر ملکوں میں، غریب عوام نہایت بے دردی سے نظر انداز کیے جا رہے ہیں۔ قرآن مجید میں کہا گیا ہے:

فَأَمَّا الْإِنسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ- وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ- كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ- وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ- وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا- وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا۔ (مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُسے عزت اور آسائش دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا۔ اور جب وہ اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُس کا رزق اُس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔ خبردار، تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے۔ اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے۔ اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔ اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو۔ سورہ فجر، آیت ۱۵ تا ۲۰)

مال کی محبت، غریبوں اور بے کسوں سے بے اعتنائی، وسائل دنیا کی جو انسانیت کی میراث ہیں، لوٹ کھسوٹ اور چند لوگوں کا دنیا کی ساری دولت پر قابض ہو جانا۔ یہ برائیاں آفتوں اور فتنوں کا سبب بنتی ہیں۔ ۱۵ مارچ کے نیویارک ٹائمس میں ایک رپورٹ چھپی جس میں معاشی عدم مساوات کو وبا پھیلنے کا ایک بڑا سبب قرار دیا گیا۔ اس میں سائنسی بنیادوں پر کہا گیا کہ اگر معاشی عدم مساوات دنیا میں اتنی زیادہ نہ ہوتی تو وبا اس طرح نہ پھیلتی۔

معاشی نابرابری کا ایک بڑا سبب وہ لبرل پالیسیاں ہیں جن کے تحت سرکاریں اپنی فلاحی ورفاہی ذمہ داریوں سے دستبردار ہو رہی ہیں اور اپنے کام مارکیٹ یعنی سرمایہ داروں کے حوالے کر رہی ہیں۔ تعلیم اور صحت عامہ جیسے اہم شعبوں کی نج کاری غریب عوام کو بنیادی سہولتوں سے بھی محروم کرنے کا ذریعہ بن رہی ہے۔ کرونا کے اس جھٹکے نے اس حقیقت کو یاد دلایا کہ سرمایہ کی چکا چوند سے وجود

میں آنے والی عالی شان دکانیں صرف اچھے وقتوں کی دوست ہوتی ہیں۔ وبا کے پہلے مرحلے ہی میں جس طرح کارپوریٹ ہسپتال پورے ملک میں بند ہوگئے اور ڈاکٹر غائب ہوگئے اور سارا بوجھ سرکاری ہسپتالوں کے کم زور انفرااسٹرکچر پر آن پڑا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفع کی بنیاد پر انسانی سماج کی تمام ضروریات کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ نفع کا محرک ایسے ہنگامی حالات میں ماند پڑ جاتا ہے، اس لیے بنیادی انسانی ضروریات کو خرید و فروخت کی چیز بنا دینے (commodification) کا سرمایہ دارانہ رجحان، انسانی سماج کے لیے نہایت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔

ماحولیاتی بحران

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو اچھی زندگی کے لیے تمام ضروری وسائل فراہم کیے ہیں۔ لیکن تعیشات کی ہوس اور سرمایہ دارانہ نظام نے دنیا میں وسائل کی ایسی لوٹ مچائی کہ آج ہماری ہوا، پانی اور ماحول سب کچھ زہر سے بھر گیا۔ متعدد تحقیقات آچکی ہیں کہ نیول کرونا جیسے نت نئے جرثومے انسانی زندگیوں کو جس خطرے سے دوچار کر رہے ہیں اس کا ایک اہم سبب ماحولیاتی عدم توازن ہے۔ اکثر بیماریاں حیاتیاتی تنوع کے مراکز (biodiversity hotspots) سے نکل رہی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اس کا اصل سبب ان علاقوں میں انسانوں کی صنعتی سرگرمیاں اور ماحولیاتی توازن (ecological balance) کے نظام میں خلل ہے۔ ماحولیاتی خلل (ecological disturbance) کی وجہ سے جانوروں تک محدود خوردنامیات (microorganisms) انسانوں میں منتقل ہو رہے ہیں اور نت نئی بیماریوں کے پھیلاؤ کا سبب بن رہے ہیں۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے تاکہ مزا چکھائے اُن کو ان کے بعض اعمال کا، شاید کہ وہ باز آئیں۔ سورہ روم، آیت ۴۱)

اس آزمائش نے رویوں میں تبدیلی سے متعلق بہت سے اسباق پڑھائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سی آسائشوں اور سہولتوں سے ہم کو عارضی طور پر محروم کر کے یہ سمجھایا ہے کہ اس دنیا میں ہماری ضرورتیں بہت محدود ہیں۔ یہ قول گاندھی جی سے منسوب کیا جاتا ہے کہ دنیا میں انسان کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کافی وسائل موجود ہیں لیکن انسان کے لالچ کا پیٹ بھرنے کے لیے وہ کافی نہیں ہیں۔

The world has enough for everyone's need, but not enough for everyone's greed.

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا: وَكُلُوا۟ وَاشْرَبُوا۟ وَلَا تُسْرِفُوٓا۟ (اور کھاؤ پیو، البتہ حد سے تجاوز نہ کرو۔ سورہ اعراف، آیت ۳۱) اور وَلَا تُسْرِفُوٓا۟ إِنَّهُۥ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ (اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ سورہ انعام، آیت ۱۴۱) اس آفت نے ساری دنیا کو یہ بات سمجھائی ہے کہ ہم نے اپنی ضرورتوں کا دائرہ غیر فطری طور پر بڑھادیا تھا۔ اسی حرص اور لالچ نے معاشی عدم مساوات پیدا کی۔ اسی سے ہمارا ماحولیاتی نظام درہم برہم ہوگیا اور اسی حرص نے اس بے نظیر ظلم کے لیے تحریک فراہم کی جس کی طرف ابھی ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اس لاک ڈاؤن میں ضروریات کی تحدید اور سادہ زندگی کا جو سبق فطرت نے ہم کو پڑھایا ہے اگر وہ ہمیں ازبر ہوجائے تو شاید انسانیت کے بہت سے مسائل حل ہوجائیں۔ لیکن اس سبق کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے اس دنیا اور کائنات کے خالق کو سمجھنا اور اس کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔

امت مسلمہ کے نصب العین کا تقاضا بھی ہے اور تاریخ کے اس نازک ترین موڑ کی پکار بھی کہ ہم یہ سب بحثیں اٹھائیں اور دنیا کو اس تباہی کے ان مخفی اخلاقی اسباب کی طرف بھی متوجہ کریں۔ اس وقت انسانوں کے ضمیر زیادہ حساس اور بیدار ہو چکے ہیں۔ اللہ کے دین اور اس کے کلام میں یقین رکھنے والے اہل ایمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ انسانیت کے ضمیر پر دستک دیں اور اس وبا

کو ایک صالح تبدیلی کا نقطہ آغاز بنانے کی جدوجہد کریں۔

(زندگی نو، اگست ۲۰۲۰)

حواشی و حوالہ جات

ا۔ Johnson, Niall P. A. S., and Juergen Mueller. "Updating the Accounts: Global Mortality of the 1918–1920 'Spanish' Influenza Pandemic." Bulletin of the History of Medicine 76 (2002) : 105–120.

۲۔ Edoardo Campanella, The Invisible Killers, in Project Syndicate, April 2010.

چیلنج اور ان کا سامنا

معاشی بحران اور ہماری ذمہ داریاں

اس وقت ملک کو ایک بڑا معاشی بحران درپیش ہے۔ اگست کے ختم پر جب مجموعی گھریلو پیداوار میں نمو (GDP growth) کے اعداد و شمار سامنے آئے تو پورا ملک چونک گیا۔ چند برسوں میں پانچ ٹریلین ڈالر کی معیشت بننے کا عزم رکھنے والے ملک کی شرحِ ترقی گھٹ کر صرف پانچ فی صد رہ گئی۔ ماہرین کی ایک جماعت کو پانچ فی صد پر بھی شبہ ہے۔ جی ڈی پی کے حساب کی جس نئی سیریز کو رائج کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ماہرین اُس کی صحت پر شبہ کرتے ہیں اور اس وجہ سے اندازہ یہ ہے کہ حقیقی جی ڈی پی گروتھ شاید پانچ فی صد سے بھی خاصی کم ہے۔ زراعت میں ترقی کی شرح دو فی صد پر آگئی جب کہ مینوفیکچرنگ میں صفر کے قریب (۰٫۶ فی صد) پہنچ گئی ہے۔ بے روزگاری کی شرح چھ فی صد سے تجاوز کر چکی ہے۔ شہری علاقوں میں شرح بے روزگاری آٹھ فی صد کے عدد کو چھو رہی ہے۔ یہ گذشتہ پینتالیس برسوں میں بے روزگاری کی بدترین صورت حال ہے۔ گاڑیوں کی صنعت اپنی تاریخ کے شدید ترین بحران سے دوچار ہے۔ فروخت میں چالیس فی صد تک گراوٹ آگئی ہے۔ ٹاٹا موٹرز اور اشوک لے لینڈ جیسی بڑی کمپنیوں نے اپنے پلانٹ بند کردیے ہیں۔ یہ صنعت ملک کی مینوفیکچرنگ جی ڈی پی کا تقریباً نصف (۴۹ فی صد) پیدا کرتی ہے اور تقریباً ساڑھے تین کروڑ لوگوں کا روزگار اس سے وابستہ ہے۔ صرف گاڑیوں کی صنعت میں تقریباً بارہ تیرہ لاکھ لوگ بے روزگار ہوگئے ہیں۔ عام اشیائے ضروریہ (بسکٹ، صابن، مصالحے وغیرہ) کی فروخت میں اضافہ کی شرح بھی حیرت انگیز حد تک کم ہوگئی ہے۔ ہندوستان یونی لیور، برٹانیکا، اور ڈابر جیسی کمپنیاں تک سخت دباؤ محسوس کر رہی ہیں اور اپنا پروڈکشن کم کرنے پر مجبور ہیں۔ ملک میں تقریباً

تیرہ لاکھ گھر اور رہائشی اپارٹمنٹ تعمیر ہونے کے بعد خالی پڑے ہیں اور خریدار موجود نہیں ہیں۔ تعمیراتی صنعت پر ڈھائی سو سے زیادہ دیگر صنعتیں منحصر ہوتی ہیں (اسٹیل اور سمینٹ سے لے کر پینٹ اور فرنیچر تک)، یہ ساری صنعتیں بری طرح متاثر ہیں۔

یہ چند حقائق اس اندازے کے لیے کافی ہیں کہ معاشی بدحالی اور روزگار سے اچانک محروم ہو جانے کی صورت حال کس قدر تشویش ناک ہوتی جارہی ہے۔ شہروں میں روزگار سے محرومی کے قصے گھر گھر عام ہو گئے ہیں۔ دیہاتوں میں بے روزگاری تو اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ بازار سنسان پڑے ہیں اور انتہائی مصروف بازاروں اور شاپنگ مالوں میں بھی سناٹا ہے۔ زمینوں کی خرید و فروخت تقریباً بند سی ہوگئی ہے۔ سونے کے دام آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ نتیجتاً سونے کی خرید و فروخت بھی متاثر ہے۔

ان معاشی حالات نے بلاشبہ ملک کے کروڑوں عوام کو متاثر کیا ہے۔ خاص طور پر غریب عوام کی مشکلات بے حد بڑھ گئی ہیں اور اندازہ یہ ہے کہ یہ مشکلات آئندہ اور بڑھیں گی۔ صورت حال اسی طرح جاری رہی تو اس سے بڑا خلفشار پھیلنے کا امکان ہے۔ ہمارے ملک میں نوجوانوں کا تناسب بہت زیادہ ہے اور ہر سال تقریباً دو کروڑ نئے نوجوان نوکریوں کی تلاش میں جاب مارکیٹ میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ تعداد آسٹریلیا کی جملہ آبادی کے مساوی ہے۔ ایسے ملک میں معاشی کساد بازاری اور اس کے نتیجے میں روزگار کے بحران کی صورت حال بہت خطرناک ہوتی ہے۔ ڈیموگرافی کے ماہرین اسے آبادیاتی آفت (demographic disaster) کہتے ہیں۔ نوجوانوں کی اِس بڑی تعداد کو روزگار میسر نہ آئے تو پھیلنے والی مایوسی بہت سے سماجی مسائل پیدا کرتی ہے اور نسل پرستی، فرقہ پرستی، خانہ جنگی، اور فتنہ و فساد کا باعث بن سکتی ہے۔ اس لیے یہ مسئلہ سنجیدہ توجہ کا مستحق ہے۔

صورت حال کے اسباب: ماہرین کی آرا

اس صورت حال کے اسباب کیا ہیں؟ اس سوال پر ماہرین معاشیات دو خیموں میں بٹے

ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف حکومت اور اس کے حامی ہیں جو اسے کوئی بڑا بحران ماننے کے لیے ہی تیار نہیں ہیں۔ گروتھ میں کمی کو وہ 'دَوری سست روی' (cyclical slowdown) باور کراتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں تیز رفتار ترقی اور سست رفتاری کے دَور (cycles) یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں۔ اُن کے خیال میں، یہ بھی ایسا ہی ایک دَور یا سائیکل ہے اور کچھ وقت کے بعد تیز رفتار ترقی دوبارہ بحال ہو جائے گی۔ بعض لوگ اسے عالمی معاشی بحران سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ اُن کے مطابق، امریکہ میں معاشی بحران، امریکہ اور چین کے درمیان تجارتی جنگ جس کے نتیجہ میں چینی مصنوعات کی فروخت میں کمی اور چین کی شرح ترقی میں گراوٹ، چین میں قرضوں کا بحران، جرمنی میں کساد بازاری، بریگزٹ وغیرہ جیسے عوامل کے نتیجہ میں ہمارے ملک کی برآمدات کم ہوئیں اور اس کا اثر معاشی ترقی پر پڑا۔ اس طرح یہ سرکاری بیانیہ صورتِ حال کے لیے صرف بیرونی عوامل کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ بیانیہ بہت کم زور اور بے بنیاد ہے۔ یہ بحران کوئی دَوری عمل نہیں ہے بلکہ ساختیاتی (structural) ہے، یعنی اس کا تعلق حکومت کی پالیسیوں سے ہے۔ عالمی بحران کے باوجود تیسری دنیا کے اکثر ممالک کی معیشتوں کی ترقی کی شرح میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ خود ہمارے پڑوس میں بنگلہ دیش تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ ۲۰۰۸ میں عالمی بحران اس سے کہیں زیادہ شدید تھا لیکن ہمارا ملک اس کے اثرات سے بچا رہا۔ اس بحران کی جڑ برآمدات سے متعلق نہیں ہے بلکہ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ برآمدات میں کوئی غیر معمولی کمی نہیں آئی ہے۔ اس مسئلہ کا اصل تعلق، خود اندرونِ ملک طلب (demand) کی کمی سے ہے۔ اس لیے عالمی بحران کا حوالہ دے کر بچا نہیں جا سکتا۔

دوسرا اہم تجزیہ وہ ہے جو اپوزیشن سے متعلق ماہرین پیش کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین تجزیہ وہ ہے جو سابق وزیر اعظم اور ممتاز ماہر معاشیات جناب منموہن سنگھ نے اپنے ویڈیو بیان میں کیا ہے۔ اس تجزیے میں اس بحران کی ساری ذمہ داری بی جے پی حکومت کے

عاجلانہ اقدامات خصوصاً نوٹ بندی اور جی ایس ٹی کے غیر حکیمانہ اور عاجلانہ نفاذ پر ڈال دی گئی ہے۔
اگرچہ سابق وزیر اعظم نے معیشت کے احیا کے لیے جو پانچ نکاتی پروگرام تجویز کیا ہے، اُس کی بعض باتیں معقول ہیں (ان کا جائزہ ہم اگلی سطروں میں لیں گے) لیکن جس طرح اِس بحران کی مکمل ذمہ داری موجودہ حکومت کے چند ناعاقبت اندیش فیصلوں اور اقدامات پر ڈال دی گئی ہے، اُس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ سنجیدہ معاشی تجزیے سے زیادہ ایک سیاسی بیان ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نوٹ بندی نہایت نقصان دہ فیصلہ تھا اور اس نے ملک کی معیشت کو شدید زک پہنچائی۔ اسی طرح جی ایس ٹی کو جس عاجلانہ اور بے ہنگم طریقہ سے نافذ کرنے کی کوشش کی گئی اس سے بھی معیشت کا ہر شعبہ متاثر ہوا۔ لیکن اِن عوامل نے بحران کی صرف شدت بڑھائی ہے۔ اس بحران کا اصل سبب وہ سرمایہ دارانہ پالیسیاں ہیں جو عالمی استعمار کے دباؤ میں اختیار کی جاتی رہی ہیں، جو سابقہ حکومتوں کے زمانے میں اختیار کی گئیں اور نئی حکومت نے انھیں اور زیادہ جوش سے اور عالمی استعمار اور دیسی سرمایہ داروں کے ساتھ اور گہری وفاداری کے جذبہ سے آگے بڑھایا۔ ہم ان پالیسیوں کا مختصر تجزیہ کریں گے اور یہ واضح کریں گے کہ اسلام کی معاشی تعلیمات کیسے ان مسائل کو حل کرسکتی ہیں؟ اور اہل اسلام کا کیا رول ہونا چاہیے؟

بحران کا پہلا سبب: غریب دشمن معاشی پالیسیاں

گذشتہ کئی برسوں سے ہمارے ملک میں جو پالیسیاں اختیار کی جارہی ہیں، اُن کا ہدف ملک کے عوام سے زیادہ چند گنے چنے سرمایہ داروں کا مفاد رہا ہے۔ آج بھی ہمارے ملک میں نصف سے زیادہ آبادی کا ذریعہ معاش زراعت ہے۔ حکومتوں نے زراعت سے مجرمانہ غفلت کی مسلسل پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ اس لیے کہ زراعت سے سرمایہ دار کو فوری کوئی فائدہ نہیں ہے۔ روزگار کا دوسرا سب سے بڑا ذریعہ چھوٹے کاروبار (retail) ہیں۔ بیرونی سرمایہ کاری، بڑے کارپوریٹ اداروں کے داخلے اور آن لائن کاروبار کے فروغ کی پالیسیوں نے اس شعبے میں بھی روزگار کے شدید مسائل پیدا کیے ہیں۔ تیسرا بڑا سیکٹر مینوفیکچرنگ کا ہے جو مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کو روزگار فراہم کرتا ہے۔ یہ

سیکٹر بھی بری طرح زوال کا شکار ہے۔ ملک کے بڑے کارپوریٹ اداروں کو زیادہ فائدہ سروس سیکٹر اور حکومت کے بڑے بڑے انفرااسٹرکچر منصوبوں میں نظر آتا ہے جن کے کنٹریکٹ سرکار سے سانٹھ گانٹھ کر کے وہ آسانی سے حاصل کر لیتے ہیں۔حکومت بھی انھی شعبوں پر توجہات مرکوز کیے ہوئے ہے۔ان شعبوں میں بڑی تعداد میں عام لوگوں کو روزگار نہیں ملتا۔اس سے سرمایہ داروں کو ضرور فائدہ ہوتا ہے، جی ڈی پی بھی بڑھتا ہے، لیکن روزگار پیدا نہیں ہوتا۔ایک سو چالیس کروڑ آبادی کے اس ملک میں حکومت کی توجہ ان شعبوں (labour intensive sectors) پر ہونی چاہیے جو زیادہ روزگار پیدا کرتے ہیں۔ ہندوستان جیسے غریب ملک میں غیر رسمی معیشت (informal economy) کا بڑا رول ہے۔ ملک کی معیشت کا بڑا حصہ اسی پر مبنی ہے اور یہی بڑے پیمانہ پر روزگار بھی پیدا کرتا ہے۔ غیر رسمی معیشت کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے معیشت عالمی مالیاتی بازاروں اور عالمی کساد بازاری وغیرہ کے اثراتِ بد سے محفوظ رہتی ہے۔ لیکن بڑے سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچانے کے لیے غیر رسمی زمرے کو کم زور کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں ایک طرف غربت اور بے روزگاری بڑھی اور دوسری طرف پوری معیشت عالمی سرمایہ داروں کے چنگل میں چلی گئی اور عالمی مالیات کے اتار چڑھاؤ سے تیزی سے متاثر ہونے لگی۔

انھی پالیسیوں کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ملک میں معیشت کی ترقی کے باوجود امیری غریبی کا فرق بڑھتا جارہا ہے۔اس سال کے اوائل میں آکسفام نے جو اپنی رپورٹ جاری کی تھی اس کے مطابق ایک فی صد امیر ترین لوگ اس وقت ملک کی دولت کے تین چوتھائی حصہ پر (۷۳ فی صد) قابض ہیں۔امیر ترین ایک فی صد آبادی کا یہ حصہ گذشتہ سال ۵۸ فی صد تھا۔یعنی ایک سال میں ان امیروں کی دولت میں اکیس لاکھ کروڑ روپیوں کا اور ملک کی دولت میں ان کے حصہ میں پندرہ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔اس کے بالمقابل ملک کی پچاس فی صد غریب تر آبادی یعنی ۶۷ کروڑ لوگوں کے پاس ملک کی دولت کا صرف دو فی صد حصہ ہے۔ہمارا ملک دنیا میں ان چند ملکوں میں سے ایک ہے جہاں معاشی نابرابری سب سے زیادہ ہے اور اس نابرابری میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ گذشتہ دس برسوں میں دولت کی غیر معمولی پیداوار کے باوجود غریبی کم کرنے اور عام انسانوں کے

مسائل حل کرنے میں اس سے مدد نہیں ملی ہے۔

خدا کا رزق تو ہرگز زمیں پر کم نہیں یارو
مگر یہ کاٹنے والے، مگر یہ بانٹنے والے

جب عام لوگ روزگار سے محروم ہوجاتے ہیں تو ان کی قوتِ خرید کم ہوجاتی ہے۔ جس کی وجہ سے بازار میں طلب کم ہوجاتی ہے۔ دولت صرف چند بڑے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں مرکوز ہوجائے تو عام لوگ نہ گاڑیاں خرید سکتے ہیں اور نہ گھر بنا سکتے ہیں بلکہ بسکٹ اور صابن کی خرید میں بھی کٹوتی کرنے لگتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بازار ٹھنڈے پڑجاتے ہیں اور کساد بازاری کی فضا عام ہوجاتی ہے۔ اس وقت کے بحران کا خلاصہ یہی ہے۔ یہ بات سب لوگ مان رہے ہیں کہ اس بحران کا تعلق طلب سے ہے۔ طلب بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ سرمایہ دار کے ساتھ عام آدمی کے ہاتھ میں بھی پیسہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جناب منموہن سنگھ نے اپنی تجاویز میں دوسری اور چوتھی تجویز عام آدمی کی قوتِ خرید بڑھانے سے متعلق دی ہے یعنی یہ تجویز کہ زرعی معیشت اور دیہی صارفیت کو ترقی دی جائے اور یہ کہ اُن صنعتوں (labour intensive) کو فروغ دیا جائے جو زیادہ لوگوں کو روزگار دے سکتی ہیں۔

اسلام ترقی کا قائل ہے لیکن کچھ شرطوں کے ساتھ۔ جس طرح کمیونزم کا نعرہ مساوات ہے اور سرمایہ داریت کا نعرہ آزادی اور گروتھ ہے، اسلام کا نعرہ عدل ہے۔ عدل میں آزادی، مساوات اور گروتھ بھی شامل ہیں۔ لیکن یہ قدریں غیر مشروط نہیں ہیں بلکہ عدل کے تقاضوں کے ماتحت ہیں۔ نظام سرمایہ داری، سرمایہ اور معاشی ترقی کو آگے اور انسان کو پیچھے رکھتا ہے۔ جب کہ اسلام کے نزدیک انسان اصل ہے اور سرمایہ اور ترقی محض انسان کی خدمت کے لیے ہیں۔ چنانچہ ترقی اور گروتھ پر انسانیت اور اس کے تقاضے مقدم ہیں۔

باری تعالی کا ارشاد ہے:

مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ

وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ (ان آبادیوں کے جن اموال کو اللہ نے اپنے رسول کو عطا کیا ہے وہ اللہ، اس کے رسول اور رسول کے قرابت داروں، نیز یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے لیے مخصوص ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ مال ودولت تمہارے صاحب ثروت لوگوں ہی کے درمیان چکر کھاتی رہ جائے۔ سورہ حشر، آیت ۷)

گویا معاشی پالیسی کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہونا چاہیے کہ مال دولت مندوں کے درمیان گردش نہ کرے بلکہ دولت مندوں سے غریبوں کی طرف جائے۔ اسلامی شریعت نے اس کے لیے سود کی حرمت، زکوۃ کی فرضیت اور وراثت کے احکام جیسے طریقے اختیار کیے ہیں۔ حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان طریقوں کے علاوہ وہ ٹیکسوں کا نظام، خرچ اور رعایتوں کا نظام اور عمومی ترقیاتی پالیسی کو اس طرح تشکیل دے کہ مال امیروں سے غریبوں کی طرف جائے اور ممکنہ حد تک وسائل اور دولت کی مساویانہ تقسیم ہو۔ اشتراکیت کی طرح مساوات کا غیر فطری تصور اسلام نہیں رکھتا، لیکن یہ ضرور چاہتا ہے کہ پالیسی اقدامات کے ذریعے ممکنہ حد تک نابرابری کم کی جائے۔

پالیسی کے بعد بھی جو غربت رہ جائے اس کے ازالے کے لیے اسلام انفاق اور صدقات کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتا ہے اور زکوٰۃ کا مہتم بالشان نظام دیتا ہے۔ زکوٰۃ اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ غریب لوگوں کے پاس بھی پیسہ رہے اور وہ بھی خرچ کرتے رہیں۔ رمضان میں اور عید سے قبل ہم دیکھتے ہیں کہ غریب لوگ بھی کپڑے اور عید کا سامان خریدتے ہیں۔ اس طرح انفاق فی سبیل اللہ اور زکوٰۃ کا نظام اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ طلب یعنی ڈیمانڈ ہمیشہ باقی رہے اور اس کے نتیجہ میں معیشت میں کساد کبھی نہ آنے پائے۔ زکوۃ کا نظام اللہ تعالیٰ نے اس طرح تشکیل دیا ہے کہ اس کے اندر خود، نابرابری کو کم کرنے اور آبادی کے تمام حصوں کی قوت خرید بڑھانے کی معجزانہ معاشی صلاحیت موجود ہے۔ چند سال پہلے (۲۰۱۳ میں) مشہور فرانسیسی ماہر معاشیات تھامس پکیٹی (Thomas Piketty) نے اپنی ایک کتاب کے ذریعے معاشیات کی دنیا میں ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ ان کی کتاب Capital in the Twenty-First Century بہت مشہور ہوئی اور کئی سال تک

دنیا میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب بنی رہی۔ اس کتاب میں پکیٹی نے دنیا میں بڑھتی ہوئی معاشی نابرابری کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب سرمائے پر منافع کی شرح (rate of return on capital) ملک کی معاشی ترقی کی شرح (rate of growth) سے بڑھ جاتی ہے تو دولت چند ہاتھوں میں، یعنی ایک فی صد اور دس فی صد امیر ترین لوگوں کے ہاتھوں میں مرکوز ہونے لگتی ہے۔ منافع کی شرح اور معاشی ترقی کی شرح میں یہ فرق جتنا زیادہ ہوگا، ارتکاز دولت کی رفتار اتنی ہی تیز ہوگی۔ پکیٹی نے عدم مساوات کے عالمی مسئلہ کا جو حل تجویز کیا ہے، وہ زکوۃ کی ظاہری شکل سے بہت مشابہ ہے۔ اس نے تجویز کیا ہے کہ آمدنی پر مروج ٹیکسوں کے علاوہ، جملہ اثاثوں (assets) پر ٹیکس لگایا جائے تاکہ منافع کا کچھ حصہ کم ہو اور شرح منافع، شرح ترقی سے قریب تر اور پھر کم تر ہو جائے۔ یہی کام زکوۃ کرتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ پکیٹی نے اثاثوں پر ٹیکس کی جو شرح تجویز کی ہے وہ بھی زکوۃ کی شرح سے قریب تر ہے۔ پکیٹی کی تجویز کردہ شرح دو فی صد ہے جب کہ زکوۃ ڈھائی فی صد ہوتی ہے۔

بحران کا دوسرا سبب: سود پر مبنی معیشت

اس بحران کا دوسرا سبب معیشت کا سودی قرضوں پر انحصار ہے۔ کساد بازاری اور ترقی کے ادوار، سودی معیشت کی لازمی خصوصیت ہے۔ جدید سودی سرمایہ دارانہ معیشت پر سود اور سودی شرحوں کا بہت ہی جابرانہ کنٹرول ہوتا ہے۔ پوری معیشت سود کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ سودی قرضے دراصل نظام سرمایہ داری کی مکروہ فریب کاریوں کا مظہر ہیں۔ یہ نظام لوگوں کے اندر، آمدنی سے زیادہ خرچ کرنے (consumption) کی لامحدود ہوس پیدا کرتا ہے۔ اور خرچ کرنے کے لیے پیسہ نہ ہو تو سودی قرضوں کا جال بچھاتا ہے۔ جب بنکوں کے پاس رقومات جمع ہو جاتی ہیں تو وہ زیادہ سے زیادہ قرض دینا چاہتے ہیں۔ کم شرح سود پر وہ آسان شرطوں پر قرضے بانٹنے لگتے ہیں۔ لوگ قرض لے کر مصنوعات خریدتے ہیں۔ نتیجہ میں طلب غیر فطری طور پر بڑھ جاتی ہے۔ اس کو پورا کرنے کے لیے کمپنیاں قرض لے کر پروڈکشن بڑھاتی ہیں۔ اس طرح ترقی کا دور چلتا ہے۔ یہ دور کچھ ہی عرصہ

میں اپنے کمال کو پہنچتا ہے اور پھر سود اپنے کرشمے دکھانا شروع کرتا ہے۔ اور اس کے بعد، اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر، ایک دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔

ڈیمانڈ بڑھنے کی وجہ سے اشیا مہنگی ہونے لگتی ہیں۔ صرف اور پیداوار بڑھنے سے قرضوں کا ڈیمانڈ بڑھ جاتا ہے۔ جب لوگ زیادہ خرچ کرنے لگتے ہیں تو بچت کم ہوجاتی ہے اور بچت میں کمی کی وجہ سے بنکوں کے پاس سرمائے کی کمی ہونے لگتی ہے۔ سرمائے (بچت) کی کمی اور قرضوں کی طلب میں اضافہ، سود کی شرحیں بڑھنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

سود کی شرح بڑھتے ہی معکوس عمل شروع ہوجاتا ہے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی اور سود کی بڑھی ہوئی شرح لوگوں کو قرضے لینے اور خرچ کرنے سے روکتی ہے۔ مایوسی اور اندیشے بڑھ جاتے ہیں۔ نتیجتاً لوگ بچت کرنے لگتے ہیں۔ ڈیمانڈ کم ہوجاتی ہے۔ کمپنیوں کا پروڈکشن گھٹ جاتا ہے۔ روزگار کے مواقع کم ہوجاتے ہیں۔ یہ کساد بازاری کا دور (recession) کہلاتا ہے۔ یکے بعد دیگرے خوشحالی اور کساد بازاری کے یہ چکر سود کے ڈائنامکس کا لازمی حصہ ہیں۔ نوبل انعام یافتہ ماہر معاشیات ملٹن فرائڈ مین کا مقولہ اسلامی معاشیات کے حلقوں میں بہت مشہور ہوا۔ انھوں نے کہا تھا:

> امریکی معیشت کے اس بے نظیر غلط رویے کا سبب کیا ہے؟ فوری جواب جو ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا سبب سودی شرحوں کا غلط رویہ ہے۔

زیادہ منافع دینے والی صنعتیں بھی ہر طرح کے حالات میں زیادہ منافع نہیں دیتیں۔ چنانچہ خاص طور پر کساد بازاری کے دور میں متوقع منافع، شرح سود سے کم ہو تو کوئی تاجر، تجارت کا رسک لینا نہیں چاہتا۔ نتیجتاً زیادہ نفع کے انتظار میں سرمایہ بے کار پڑا رہتا ہے۔ اس کیفیت کو stagflation کہتے ہیں۔ یہ کیفیت بھی سودی نظام کا لازمی خاصہ ہے۔ اس کے نتیجہ میں کساد بازاری کی کیفیت اور شدید ہوجاتی ہے اور پوری معیشت پر سکتہ ساطاری ہوجاتا ہے۔

گذشتہ دس بارہ برسوں کی ہمارے ملک کی معاشی تاریخ بھی اوپر بیان کیے گئے ڈائنامکس کی تائید کرتی ہے۔ جب معیشت ترقی کر رہی تھی تو بنکوں نے بڑے پیمانے پر قرضوں کی ہوس پیدا

کی۔ قرضوں کا ڈیمانڈ بڑھا تو مالیاتی اداروں نے نئے نئے قرض خواہ تلاش کرنے شروع کیے۔ بینکوں نے سود کے لالچ میں انھیں اپنی سکت سے زیادہ قرضے لینے پر آمادہ کیا۔ پھر بنکوں نے مالیاتی اداروں (shadow banking) کے واسطے سے بھی قرضے بانٹنے شروع کیے۔ چنانچہ گذشتہ دس برسوں میں ہمارے ملک میں گھریلو قرضے آٹھ لاکھ کروڑ سے بڑھ کر اکیس لاکھ کروڑ ہو گئے۔ اب گھریلو قرضے جی ڈی پی کا گیارہ فی صد ہیں جو ہندوستان جیسے غریب ملک کے لیے ایک غیر معمولی بات ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ گھریلو قرضے جب بڑھتے ہیں تو کچھ عرصہ بعد کساد بازاری پیدا ہو جاتی ہے۔

جب گروتھ متاثر ہوئی تو بینکنگ سیکٹر اس کی تپش کی زد میں آنے لگا۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ملک کے بینک کا نظام دنیا کے بدترین بحران سے دوچار ہے۔ خراب قرضے (bad debts) بڑھتے بڑھتے گیارہ لاکھ کروڑ کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ غیر کارکرد اثاثوں (non-perfoming assets یعنی بینک کے وہ قرضے جن کی واپسی مشکل ہو) کے اعتبار سے اب ہمارا ملک یونان اور اٹلی جیسے ملکوں کے قریب پہنچ چکا ہے۔ (یہ وہ ممالک ہیں جن کا دیوالیہ ہو چکا تھا اور بڑے یورپی ملکوں نے یورپی یونین کی معیشت کو بچانے کے لیے ان کو بیل آوٹ کیا تھا) اس کے نتیجہ میں بینکوں کی جانب سے قرض جاری کرنے کی صلاحیت کم ہو گئی۔ سودی نظام، سودی قرض کے بغیر چل نہیں سکتا۔ چنانچہ کمپنیوں کو قرض ملنا بند ہو گیا تو انھوں نے پروڈکشن روک دیا، خریدار بھی کنزیومر لون کے ذریعے خرید کے عادی ہو گئے ہیں۔ لون ملنا مشکل ہو گیا تو خرید بھی متاثر ہو گئی۔ یہ بھی معاشی سست روی کا ایک اہم سبب ہے۔ اب حکومت ٹیکس دہندگان کی محنت کی گاڑھی کمائی کے تقریباً پچاس ہزار کروڑ روپے بینکنگ کے نظام میں داخل کر رہی ہے اور سرکاری بینکوں کے انضمام اور انھیں سرکاری خزانہ سے پیسہ فراہم کر کے اس بحران پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے اور خود سرکاری خسارہ کی بھرپائی کے لیے ریزرو بینک کے ریزرو سے پونے دو لاکھ کروڑ حاصل کر لیے ہیں۔

اسلام نے اسی لیے سود پر سختی سے پابندی لگائی ہے۔ قرآن مجید نے بہت واضح الفاظ میں سود سے منع کیا ہے:

> یَاأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا لَا تَأْکُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُونَ۔ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِی أُعِدَّتْ لِلْکَافِرِینَ۔ (اے ایمان والو! دو گنا اور چوگنا کر کے سود مت کھایا کرو، اور اللہ سے ڈرا کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۳۰، ۱۳۱)

قرآن مجید یہ بھی کہتا ہے کہ سود کے نتیجہ میں مال سے برکت ختم ہو جاتی ہے اور مال چاہے بظاہر بڑھتا ہوا محسوس ہو، لیکن اصل میں کم ہونے لگتا ہے۔

> یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَیُرْبِی الصَّدَقَاتِ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ أَثِیمٍ (اور اللہ سود کو مٹاتا ہے (یعنی سودی مال سے برکت کو ختم کرتا ہے) اور صدقات کو بڑھاتا ہے (یعنی صدقہ کے ذریعے مال کی برکت کو زیادہ کرتا ہے)، اور اللہ کسی بھی ناسپاس نافرمان کو پسند نہیں کرتا۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۷۶)

سود کی حرمت کا اصول، ایک متبادل نظام کو جنم دیتا ہے جس کی بنیاد نفع و نقصان میں شرکت (equity based) پر ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں سرمایہ دار اور تاجر، دونوں تجارت کے خطرے (risk) میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ تجارت اچھی ہوتی ہے تو دونوں کو متناسب فائدہ ہوتا ہے اور جب تجارت گھاٹے کا شکار ہوتی ہے تو سرمایہ دار بھی نقصان اٹھاتا ہے۔ اس متبادل مالیاتی نظام کے کئی فائدے ہیں۔

سارا کاروبار نفع و نقصان میں متناسب شرکت کی بنیاد پر ہوتا ہے اس لیے اُس عدم استحکام (instability) یا کساد بازاری و ترقی کے چکروں کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا جو سودی نظام میں آتے رہتے ہیں۔ مالیاتی نظام کے مختلف افعال، مثلاً مالیہ کی فراہمی، اشیاء کا پروڈکشن اور ان کا صرف، بچت وغیرہ میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور بازار کی ضرورت کے مطابق ان میں توازن (equilibrium) قائم رہتا ہے۔ چوں کہ کساد بازاری اور ترقی کے چکر نہیں چلتے اس لیے یکایک روزگار میں اضافہ اور یکایک روزگار میں گراوٹ جیسی کیفیات بھی پیدا نہیں ہوتیں۔ اسی طرح قیمتوں میں توازن رہتا ہے اور یکایک قیمتیں نہیں بڑھتیں۔ تاجر کو متعین شرح پر سود ادا کرنا نہیں ہوتا بلکہ وہ حقیقی نفع میں

سرمایہ دار کو شریک کرتا ہے اس لیے کم شرح منافع کی تجارتیں بھی چلتی ہیں۔ فلاحی کاموں کے لیے بھی سرمایہ دستیاب رہتا ہے۔ اور اگر کسی وقت تجارت زیادہ منافع نہیں دے پارہی ہے تب بھی تجارت جاری رہتی ہے اور سرمایہ بے کار نہیں رہتا۔ اس طرح سرمایہ کے بھرپور استعمال کی وجہ سے، کساد افراطِ زر (stagflation) کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔

چوں کہ ملک کے کروڑوں بچت کار نفع میں شریک ہوتے ہیں اس لیے اگر تاجر نے زیادہ نفع کمایا تو ان بچت کاروں کو بھی اسی تناسب سے زیادہ منافع ملتا ہے۔ یوں دولت اربوں بچت کاروں سے چند تاجروں کو منتقل نہیں ہوتی۔ اور ویسی عدم مساوات پیدا نہیں ہوتی جیسی نظام سرمایہ داری میں نظر آتی ہے۔ نفع میں شریک ہونے کی وجہ سے بچت کاروں (جو آبادی کا بہت بڑا حصہ ہوتے ہیں) کی دولت بڑھتی ہے۔ ان کی قوت صرف بڑھتی ہے جس سے اشیاء کا ڈیمانڈ بڑھتا ہے اور پوری معیشت ترقی کرتی ہے۔ اس طرح سود کا خاتمہ معاشی ظلم، استحصال اور نابرابری کے خاتمہ کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

موجودہ معاشی بحران پر ایک ٹی وی مباحثہ میں حصہ لیتے ہوئے سابق وزیر ملند دیورا نے بہت واضح طور پر کہا کہ شراکت داری (equity finance) کی بنیاد پر جو لوگ کاروبار کررہے ہیں ان کی تجارتیں اس وقت سب سے زیادہ محفوظ ہیں اور ان کے کاروبار میں سست روی کے آثار بھی بہت کم ہیں۔ جو کاروبار بینکوں اور قرضوں پر منحصر ہیں، وہی متاثر ہیں۔

بحران کا تیسرا سبب: کرپشن، سیاست دانوں اور سرمایہ داروں کا گٹھ جوڑ

مذکورہ دونوں اسباب کا تعلق ایک اور بڑے سبب سے ہے یعنی کرپشن اور سیاست دانوں اور سرمایہ داروں کا ناپاک گٹھ جوڑ۔ سرمایہ دار اپنے عارضی فائدہ کی خاطر حکومتوں پر غلط پالیسیوں کے لیے اپنے سرمایہ کی طاقت سے دباؤ ڈالتے ہیں۔ حکومتیں ان کے لیے پالیسیاں بھی بناتی ہیں اور سرکاری بینکوں سے ان کو بھاری قرضے بھی دلاتی ہیں۔

سترہویں جنرل الیکشن میں تقریباً پچاس ہزار کروڑ روپیوں کا خرچ ہوا جو گذشتہ انتخابات کے

خرچ کا دوگنا تھا۔ اس میں سے پچاس سے ساٹھ فی صد خرچ صرف ایک جماعت نے کیا جو بعد میں دوبارہ برسر اقتدار آگئی۔ اس خرچ کا ایک بڑا حصہ اُس بدنام زمانہ اسکیم سے حاصل ہوا جو سابق وزیر خزانہ آنجہانی ارون جیٹلی نے تین سال پہلے شروع کی تھی اور جسے الیکٹورل بانڈ کہا جاتا ہے۔ الیکٹورل بانڈ کے ذریعے سرمایہ دار سیاسی جماعتوں کو بے نامی عطیات دے سکتے ہیں۔ سابق چیف الیکشن کمشنر ایس وائی قریشی نے اس کے بارے میں بہت صحیح کہا کہ یہ کرونی کیپیٹلزم کو قانونی جواز فراہم کرنے کا عمل ہے۔

اس وقت جن خراب قرضوں (bad debts) کی وجہ سے ملک کا سارا بینکنگ نظام بحران کا شکار ہے، آر بی آئی کے مطابق ان کا چوتھائی حصہ صرف بارہ کمپنیوں نے لے رکھا ہے (ان کمپنیوں کے نام ظاہر نہیں کیے گئے)۔ بھاری نادہندہ قرضوں میں کمپنیاں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں اور حکم رانوں کے دباؤ پر بینک انھیں مزید قرضے جاری کر دیتے ہیں۔ ابھی اس ہفتہ پنجاب اینڈ مہاراشٹر بینک کا جو بحران سامنے آیا، اس میں یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ بینک نے اپنے جملہ اثاثوں کا تہتر فی صد یعنی ساڑھے چھ ہزار کروڑ روپے، صرف ایک تعمیراتی کمپنی کو قرض میں دے رکھا تھا۔ قرض ڈوب گیا اور اب غریب عوام کی زندگی بھر کی کمائی پر مبنی دس ہزار کروڑ سے زائد رقم بینک میں پھنسی ہوئی ہے۔

کرونی کیپیٹلزم (crony capitalism) اس وقت ساری دنیا کا نہایت پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔ کرونی کیپٹلزم اُس کرپٹ نظام کو کہتے ہیں جس میں بزنس، بازار کی آزاد قوت کے ذریعے نہیں چلتے بلکہ سیاست دانوں سے گٹھ جوڑ اور اپنے حق میں نامناسب فیصلے کرا کے ترقی کرتے ہیں۔ کرونی کیپیٹلزم انڈیکس کے اعتبار سے ہمارا ملک دنیا کے بدترین ملکوں میں سے ایک ہے۔ اور موجودہ کساد بازاری کا ایک سبب یقیناً وہ صورت حال ہے جسے رگھورام راجن نے مڈل انکم ٹریپ یا درمیانی آمدنی کا جال (middle income trap) کہا ہے اور جسے ترقی پذیر ملکوں کی ترقی کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا ہے۔ یعنی جب ممالک ترقی کرتے کرتے درمیانی آمدنی تک پہنچ جاتے ہیں تو سیاست دانوں کی مدد سے چند بڑے سرمایہ دار تمام تجارتوں پر قابض ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ چند بڑی کمپنیوں کے

آپسی گٹھ جوڑ (oligarchy) اور ان کی سیاست دانوں سے ساز باز کے نتیجہ میں نئی کمپنیوں کے لیے ترقی کے مواقع باقی نہیں رہتے اور اس سے گروتھ کم ہو جاتی ہے اور ترقی رک جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت ہمارے ملک کو یہی مسئلہ درپیش ہے۔ چند بڑے کارپوریٹ، دیگر تاجروں اور پوری غیر رسمی معیشت کو راستہ سے ہٹا کر ملک کی معیشت کے سیاہ و سفید کے مالک بن رہے ہیں اور حکومتیں ان کے اشاروں پر کام کر رہی ہیں۔

بھاری عطیات دینے والے سرمایہ داروں کے مفاد کے بعد پالیسی سازی کی دوسری اہم بنیاد، سیاست دانوں کے اپنے حقیر اور وقتی سیاسی مفادات ہوتے ہیں۔ پالیسی بناتے ہوئے اور فیصلے کرتے ہوئے عوام کے مفاد کو نہیں بلکہ اپنی فوری سیاسی اغراض کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں سیاسی انتقام، بلیک میل اور ٹیکس ٹیررزم کی جو سیاست کھیلی جا رہی ہے، اس نے بھی مارکیٹ کے اعتماد کو بری طرح مجبور کیا ہے۔ نوٹ بندی اور جی ایس ٹی کے فیصلوں کی پشت پر بھی معاشی محرکات کم اور سیاسی محرکات زیادہ تھے۔ حقیر سیاسی مفاد کی بنیاد پر پالیسی سازی کی سب سے نمایاں اور تازہ ترین مثال کشمیر کے موجودہ حالات اور کشمیر سے متعلق کیے گئے فیصلے ہیں۔

جموں کشمیر نے گذشتہ چند برسوں میں بہت تیز ترقی کی تھی۔ خاص طور پر ۲۰۱۶ میں ترقی کی رفتار سترہ فی صد سے متجاوز تھی۔ غیر یقینی حالات کی طویل تاریخ کے باوجود جموں کشمیر کی فی کس آمدنی بہار اور یوپی جیسی ریاستوں سے زیادہ ہے۔ شرحِ غربت، قومی اوسط سے کافی کم ہے۔ ہیومن ڈیولپمنٹ انڈیکس کے اعتبار سے تو یہ ریاست، گجرات اور کرناٹک جیسی ترقی یافتہ ریاستوں سے بھی آگے ہے۔ انڈیا ٹوڈے کے ریاستوں کی صورت حال پر سروے (State of the States Survey) کے مطابق ریاست کئی پہلوؤں سے ملک میں ممتاز مقام کی حامل بن چکی تھی۔ مثلاً صحت کی صورت حال کے اعتبار سے جموں و کشمیر ملک کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ ریاست تھی۔ انفراسٹرکچر کے اعتبار سے ۲۰۱۷ میں ملک کی چھٹی، تعلیم کے اعتبار سے آٹھویں سب سے ترقی یافتہ ریاست تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست میں معاشی ترقی کے غیر معمولی مواقع موجود

ہیں۔ اگر ریاست کو ترقی کے مواقع دیے جاتے تو ریاست اور ریاست کے عوام کا بھی بھلا ہوتا اور پورے ملک کی معیشت کو بھی اس سے فائدہ پہنچتا۔ لیکن حالیہ سیاسی فیصلے ٹھیک اس وقت کیے گئے جب ریاست میں سیب کی فصل تیار تھی، سیاحت کا موسم شباب پر تھا اور اکتوبر تک ہوٹلوں کی بکنگ ہو چکی تھی۔ سیب کی فصل اب پیڑوں پر سڑ رہی ہے۔ جموں کشمیر ملک کی سیب کی پیداوار کا دو تہائی پیدا کرتا ہے۔ ساڑھے چھ ہزار کروڑ کی آمدنی صرف سیب کی برآمدات سے ہوتی ہے۔ ایسے وقت میں جب کہ ملک کو برآمدات بڑھانے کی سخت ضرورت ہے، اندازہ یہ ہے کہ یہ پوری فصل ضائع ہو جائے گی۔ بارہ لاکھ سیاح جو ریاست کا ہر سال دورہ کرتے ہیں، نہیں کریں گے۔ ریاست کی معیشت کا چالیس فی صد سروس سیکٹر پر منحصر ہے جو پوری طرح غیر کارکرد ہو چکا ہے۔

اس واقعہ سے ہمارے خراب معاشی حالات کا ایک اور سبب سامنے آتا ہے۔ حکم رانوں کے تنگ نظر وقتی مفادات، جو ہمیشہ عوام کے مفادات پر مقدم رکھے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے سیاست ہمیشہ معیشت پر حاوی رہتی ہے۔ یہ مسائل پھر ایک دفعہ پوری قوت سے یہ حقیقت آشکار کر رہے ہیں کہ جب تک حکم رانوں میں خدا ترسی اور جواب دہی کا احساس پیدا نہیں ہوتا، اس وقت تک حقیقی عدل ممکن نہیں ہے۔

ہماری ذمہ داریاں

یہ حالات اسلام کے نظام عدل و رحمت کی طرف متوجہ کرنے اور اسلام کی معاشی تعلیمات کی برکتوں سے اہل ملک کو روشناس کرانے کا سنہری موقع فراہم کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنے تحفظ و دفاع کی کوششوں تک محدود رہنے یا وقتی مسائل میں الجھے رہنے کے بجائے، اعتماد و حوصلہ کے ساتھ بحیثیت خیر امت اپنی اصل ذمہ داری کی طرف متوجہ ہوں تو موجودہ حالات کئی پہلوؤں سے اسلام کی دعوت کے بہترین مواقع فراہم کرتے ہیں۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ معاشی صورت حال کے اسباب اور اس کے حل کی بحث میں ہر سطح پر ہم پورے اعتماد اور قوت کے ساتھ حصہ لیں۔ عام لوگوں پر بھی یہ بات واضح کریں کہ ان مسائل کا کوئی شارٹ کٹ حل موجود نہیں ہے۔

اس مسئلہ کا فوری اور آسان حل اگر ممکن ہے تو وہ بس یہ ہے کہ حکومت غریب پرور پالیسیوں پر توجہ دے۔ کانگریس نے اپنے انتخابی منشور میں، غریب عوام کو بہتر ہزار روپے سالانہ کم سے کم آمدنی کا وعدہ کیا تھا۔ اب کانگریس کے قائدین بھی اس تجویز کو نہیں دہراتے۔ حالاں کہ اس طرح کی فلاحی اور سماجی اسکیموں کے ذریعے ہی طلب بڑھائی جاسکتی ہے اور معیشت کو ترقی کے راستہ پر لایا جاسکتا ہے۔

قدرے طویل المیعاد حل یہ ہے کہ حکومت سرمایہ دارانہ استعمار کے دباؤ میں جو پالیسیاں بنا رہی ہے، اُس سے باز آئے۔ دستور ہند کا وژن ایک ویلفیر اسٹیٹ کا وژن ہے۔ جب تک اس وژن کے مطابق پالیسیاں نہیں بنیں گی اور گروتھ کے ساتھ مناسب تقسیم پر توجہ نہیں دی جائے گی، اس طرح کے حالات آتے رہیں گے۔

لیکن اصل اور دیرپا حل یہ ہے کہ سود کے خاتمہ، قمار کے خاتمہ، زکوۃ کے نظام جیسی اصلاحات پر ملک کے عوام سنجیدگی سے غور کریں۔ یہ خالق کائنات کی تجویز کردہ تدابیر ہیں اور حالات زمانہ نے متعدد بار یہ واضح کر دیا ہے کہ ان تدابیر کو اختیار کیے بغیر جدید معیشت کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانا ممکن نہیں ہے۔ کرپشن جیسے مسائل کا خاتمہ اور مذکورہ تدابیر کی صحیح اسپرٹ کے ساتھ عمل آوری خدا ترسی اور خدا کے سامنے جواب دہی کے احساس کا تقاضا کرتی ہے۔

ان باتوں کو زبانی زیر بحث لانے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اہل اسلام، اسلام کے معاشی، تجارتی اور مالیاتی ماڈل بھی ممکنہ حد تک سامنے لانے کی کوشش کریں۔ ملک کے مختلف مقامات پر تحریک اسلامی کے افراد بلاسودی مائکرو فنانس کے جو مختلف تجربات کر رہے ہیں وہ بہت حوصلہ افزا ہیں۔ جو رپورٹیں آرہی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے عام لوگ بھی اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ یہ ماڈل کسانوں کی خودکشیوں کو روک سکتا ہے۔ غریب تاجروں اور چھوٹے صنعتکاروں کو سودی قرضوں کے چنگل میں لامتناہی طور پر پھنسنے سے روک سکتا ہے۔ سودی قرضوں سے انھیں نجات دلا کر، چھوٹی تجارتوں میں تیز رفتار گروتھ کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ یقیناً مائکرو فنانس ایک بہت ہی چھوٹا معاملہ ہے اور پوری معیشت پر اثرانداز ہونے میں اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی لیکن اس

ممکن العمل تجربہ سے اسلامی مالیات کا ایک چھوٹا نمونہ ملک کے سامنے آسکتا ہے اور لوگوں پر قرآن مجید کی اس بات کی عملی شہادت ہوسکتی ہے کہ سود سے پاک معاشی نظام خیر وبرکت کا اور معیشت میں افزائش وترقی کا باعث ہوتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ بلاسودی مائکروفنانس کی اس مہم میں امت کے اور طبقات بھی حصہ لیں اور اس سے برادرانِ وطن بھی بڑے پیمانہ پر مستفید ہونے لگیں۔ خاص طور پر دیہاتوں اور کسانوں میں اسے فروغ دیا جائے۔ اگر یہ ہوسکا تو یہ اہل اسلام کی ملک کے لیے بہت بڑی خدمت ہوگی۔ اس سے معیشت کو تھوڑا بہت سہارا بھی ملے گا، اسلام کے متبادل مالیاتی نظام کی طرف ملک متوجہ ہوسکے گا اور اسلام کے حق میں مثبت رائے عامہ بنانے اور نفرت اور تفریق کی فضا کو ختم کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ ان شاء اللہ۔ اس مقصد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مائکروفنانس کی یہ اسکیمیں اسلام کے اصولوں کی ہی نہیں بلکہ اس کے مقاصد اور اسلامی معاشیات کی اصل روح کی بھی سختی سے پابندی کرتے ہوئے چلائی جائیں۔ شراکت داری کے اصل اسلامی اصول غالب رہیں اور وقتی حیلوں اور شارٹ کٹ راستوں سے ممکنہ حد تک بچتے ہوئے، اسلام کے اصل فلسفہ کی معنویت کو عملی تجربات کے ذریعے دنیا کے سامنے لانے کی سنجیدہ کوشش ہو۔

اسی طرح اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اسلام کے اصولوں کے مطابق تجارت کے عملی ماڈل بھی ملک کے سامنے آئیں۔

(زندگی نو، نومبر ۲۰۱۹)

ظلم کے خلاف مزاحمت

ظلم کی مزاحمت انسان ہی نہیں ہر جان دار کی فطرت کا حصہ ہے۔ معمولی چیونٹی کو بھی تکلیف پہنچانے، ہلاک کرنے یا راستے سے ہٹانے کی کوشش کی جائے تو وہ مزاحمت کرتی ہے۔ افراد کی طرح قوموں کی بقا کا انحصار بھی مظالم کے خلاف مزاحمت کی صلاحیت پر ہوتا ہے۔ ہر ظالم مظلوموں سے مکمل خود سپردگی کا تقاضا کرتا ہے اور اُس سے کم پر راضی نہیں ہوتا۔ لیکن ظلم و سفاکیت کے مقابلہ میں خود سپردگی اور مداہنت کا رویہ اختیار کرنے والی قوم کا مقدر یہی ہوتا ہے کہ وہ کچل اور مسل ڈالی جائے۔ تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مزاحمت کے معقول طریقوں کو اختیار کیے بغیر کسی قوم نے اپنے اوپر ظلم کرنے والوں سے نجات حاصل کی ہو یا خود ظالم نے رحم کھا کر اس کی جان بخشی کر دی ہو۔ ظلم کے مقابلہ میں ڈٹ کر کھڑا ہونا یقینا آسان کام نہیں ہے۔ یہ قدم قدم بلاؤں کی راہ ہے اور قربانیوں کے نذرانے کے بغیر اس راہ سے گزرنا ممکن نہیں۔ لیکن ظلم سے نجات کی بس یہی ایک راہ ہوتی ہے۔ ہر ظلم کی تاریخ یا تو مظلوم قوم کے خاتمہ پر ختم ہوتی ہے یا ظلم کی مزاحمت کے نتیجہ میں ظالم کی شکست اور ظلم کے خاتمہ پر۔

کب اشک بہانے سے کٹی ہے شب ہجراں
کب کوئی بلا صرف دعاؤں سے ٹلی ہے

اسلام کی تعلیمات اور ظلم کے خلاف مزاحمت

قرآن مجید نے مسلمانوں کی ایک اہم خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ ظالموں کے لیے نرم نوالہ نہیں ہوتے۔ وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ۔ سورہ شوریٰ آیت ۳۹ (اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں)

مولانا مودودیؒ نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے:

یہ بھی اہل ایمان کی بہترین صفات میں سے ہے۔ وہ ظالموں اور جباروں کے لیے نرم چارہ نہیں ہوتے۔ ان کی نرم خوئی اور عفو و درگزر کی عادت کم زوری کی بنا پر نہیں ہوتی۔ انھیں بھکشوؤں اور راہبوں کی طرح مسکین بن کر رہنا نہیں سکھایا گیا ہے۔ ان کی شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ جب غالب ہوں تو مغلوب کے قصور معاف کردیں، جب قادر ہوں تو بدلہ لینے سے در گزر کریں، اور جب کسی زیر دست یا کم زور آدمی سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو اس سے چشم پوشی کر جائیں، لیکن کوئی طاقت ور اپنی طاقت کے زعم میں ان پر دست درازی کرے تو ڈٹ کر کھڑے ہو جائیں اور اس کے دانت کھٹے کردیں۔ مومن کبھی ظالم سے نہیں دبتا اور متکبر کے آگے نہیں جھکتا۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے وہ لوہے کا چنا ہوتا ہے جسے چبانے کی کوشش کرنے والا اپنا ہی جبڑا توڑ لیتا ہے۔[1]

اسلام کے ماننے والوں کے لیے ظلم کی مزاحمت صرف ایک فطری ضرورت ہی نہیں ہے، بلکہ اُن کے دین کا ایک اہم ترین مطالبہ اور ان کے مقام و منصب کا تقاضا بھی ہے۔ یہ اہل اسلام کا مشن ہے کہ نہ صرف اُن کے اوپر سے بلکہ دنیا کے تمام مظلوموں پر سے ظلم کے بادل چھٹ جائیں اور آدم کے ہر بیٹے اور بیٹی کو آزادی کی کھلی فضا میسر آئے۔ عدل کا قیام اور ظلم کا استیصال، دینِ اسلام کے مقاصد میں شامل ہے۔ اس کی اہمیت اور دین میں اس کی مرکزیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انسانوں کے درمیان عدل و قسط کے قیام کو اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کی بعثت کا ایک مقصد قرار دیا ہے۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں۔ سورہ حدید، آیت ۲۵) پیغمبروں کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کو بھی یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ نہ صرف خود پر ظلم کی مزاحمت کریں بلکہ عدل و انصاف کے لیے اٹھ کھڑے ہونے والے بنیں اور جہاں کہیں ظلم ہو رہا ہو، اسے روکنے کے لیے ممکنہ جدوجہد کریں۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ۔ (اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا واسطے انصاف کے علم بردار اور اس کے گواہ بنو۔ سورہ نساء، آیت ۱۳۵)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ

إنّ من أعظم المقاصد التي قصدت ببعثة الأنبياء عليهم السّلام دفع المظالم من بين الناس، فإنّ تظالمهم يفسد حالهم، ويضيق عليهم ولاحاجة إلى شرح ذلك۔ (بے شک انبیا علیہم السلام کی بعثت کے اہم ترین مقاصد میں سے ایک انسانوں میں سے ظلم و زیادتی کا ازالہ ہے۔ مظالم انسانی زندگی کے احوال کو درہم برہم کر دیتے ہیں اور ان کو سخت تنگیوں میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اور یہ بات اتنی واضح ہے کہ اس کے لیے کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔)[۲]

ظلم کے مقابلہ اور مزاحمت ہی کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ ظلم کے مقابلہ میں خاموشی اور بے حسی کی شدید الفاظ میں مذمت کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے واضح الفاظ میں یہ بات فرمائی ہے کہ ظلم کی مزاحمت نہ کرنا اللہ کے غضب اور اس کے عذاب کو دعوت دینے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ يَأْخُذُوا عَلَى يَدَيْهِ، أَوْشَكَ أَنْ يَعُمَّهُمُ اللَّهُ بِعِقَابٍ۔ (لوگ جب کسی ظالم کو دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو عنقریب اللہ ان سب پر اپنا عذاب نازل کرے گا۔)[۳]

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، اسلام کا ایک اہم رکن اور حکم ہے۔ ظلم کی مزاحمت، نہی عن المنکر کا نہایت اہم تقاضا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بنی اسرائیل کی تباہی کا ایک اہم سبب یہ بتایا ہے کہ اُن کے سربر آوردہ لوگوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام چھوڑ دیا تھا۔ اس سلسلہ کی ایک مشہور حدیث کا اختتام آں حضرت ﷺ کی امت کے نام اس اہم تنبیہ پر ہوتا ہے کہ

كَلَّا وَاللَّهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَلَتَأْخُذُنَّ عَلَى يَدَيِ الظَّالِمِ، وَلَتَأْطُرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ أَطْرًا، وَلَتَقْصُرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ قَصْرًا أَوْ لَيَضْرِبَنَّ اللَّهُ بِقُلُوبِ بَعْضِكُمْ عَلَى بَعْضٍ، ثُمَّ لَيَلْعَنَنَّكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ (اللہ کی قسم، یا تم خیر کا حکم دو گے اور منکر سے روکو گے اور ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکو گے اور اسے عدل کرنے اور حق پر قائم رہنے پر مجبور کرو گے، ورنہ اللہ تمہارے دلوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دے گا اور تم پر لعنت کرے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر کیا تھا۔)[۴]

یہی وجہ ہے کہ ظلم وزیادتی کا استیصال انبیا علیہم السلام کی جدوجہد کا ایک اہم عنوان رہا ہے۔ انبیائی جدوجہد کا یہ پہلو خاص طور پر موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں بہت ابھر کر سامنے آتا ہے جسے قرآن نے متعدد جگہ، بلکہ دیگر واقعات کے مقابلہ میں سب سے زیادہ مرتبہ، بیان کیا ہے۔ (موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کا تذکرہ اور اشارہ قرآن مجید میں تیس سورتوں میں تقریباً سو مقامات پر آیا ہے۔) فرعون ایک نسل پرست، ظالم اور استحصالی حکم ران تھا۔ جب کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے تھے جو فرعون کے نسل پرستانہ مظالم کے شکار تھے۔ اللہ کے ایک برگزیدہ رسول کی حیثیت سے موسیٰ علیہ السلام کا اصل کام تو دعوت الی اللہ تھا لیکن ساتھ ہی ان سے یہ بھی کہا گیا کہ

فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ (پس اس کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم دونوں تیرے رب کے رسول ہیں، تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے اور ان کو عذاب میں مبتلا نہ رکھ۔ سورہ طہٰ، آیت ۴۷)

خود نبی کریم ﷺ نے بھی ظلم کے خاتمہ اور عدل کے قیام کو اپنا مشن قرار دیا۔

وَاللَّهِ لَيَتِمَّنَّ هَذَا الأَمْرُ، حَتَّى يَسِيرَ الرَّاكِبُ مِنْ صَنْعَاءَ إِلَى حَضْرَمَوْتَ، لاَ يَخَافُ إِلَّا اللَّهَ (خدا کی قسم، یہ مشن مکمل ہو کر رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک سوار صنعا سے حضر موت تک جائے گا اور اسے خدا کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوگا۔)[۵]

اس طرح کے متعدد اقوال میں ظلم اور زیادتیوں کے خاتمے اور امن و امان کے قیام کو نبوی مشن کی تکمیل کی اہم علامت قرار دیا گیا ہے۔ حلف الفضول کا معاہدہ ظلم کی روک تھام ہی کا معاہدہ تھا جو نبوت کے نزول سے قبل اس وقت طے پایا تھا جب آپ ﷺ کی عمر مبارک بیس سال تھی لیکن جس کے بارے میں آپ ﷺ نے بعد میں یہ بات فرمائی کہ اگر زمانہ اسلام میں بھی مجھے اس کا واسطہ دے کر بلایا جائے تو میں حاضر ہوں گا یا یہ کہ یہ معاہدہ سرخ اونٹوں سے زیادہ مجھے محبوب ہے۔ (ما أحب أن لی به حمر النعم، ولو دعیت به فی الاسلام لأجبت)[۶]

حضرت ربعی بن عامرؓ نے رستم کے دربار میں جو تقریر کی تھی اُس میں بھی رسول اللہ کے

مشن کی یہی تشریح ملتی ہے۔

> اللّٰہُ ابْتَعَثْنَا لِنُخْرِجَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَۃِ الْعِبَادِ إِلَی عِبَادَۃِ اللّٰہِ، وَمِنْ ضِیقِ الدُّنْیَا إِلَی سِعَتِہَا، وَمِنْ جَوْرِ الْأَدْیَانِ إِلَی عَدْلِ الْإِسْلَامِ (اللہ تعالیٰ نے ہم کو مبعوث کیا ہے تاکہ ہم اس کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے نجات دلائیں اور اللہ کی بندگی میں لائیں اور دنیا کی تنگنائیوں سے اس کی وسعتوں کی طرف لے جائیں اور جھوٹے مذاہب کے مظالم سے نکال کر اسلام کے عدل میں لے جائیں۔)[۷]

انبیا علیہم السلام کے بعد، ہر زمانہ میں امت مسلمہ کی بزرگ شخصیتوں اور مجددین دین کی جدوجہد میں بھی یہ پہلو بہت نمایاں رہا۔ اسلام کی دینی تاریخ کی تمام اہم شخصیتوں کے ساتھ، ظلم وزیادتی کے خلاف جدوجہد کے ولولہ انگیز واقعات وابستہ ہیں اور ان میں سے اکثر کو اس جدوجہد کے دوران آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ کے نواسہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا اصل سبب ظالمانہ بادشاہت کے خلاف آپ کی بے باک مزاحمت ہی تھا۔ یہی سبب حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی شہادت کا بھی بنا جو حجاج بن یوسف کے مظالم کے شکار ہوئے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے اپنے عہد کے حکم رانوں کے مظالم کے خلاف آواز بلند کی اور یہ واضح موقف اختیار کیا کہ حکم رانوں کے مقابلہ میں نہی عن المنکر کا کام کیا جائے گا اور یہ ضروری ہے۔ خراسان کے فقیہ ابراہیم الصائغ سے ان کی جو گفتگو ہوئی تھی وہ اکثر اس موضوع سے متعلق مباحث میں نقل کی جاتی ہے۔ امام صاحب نے اُن سے کہا تھا کہ حکمراں اگر غلط کام کرے تو اس کی نکیر واجب ہے۔ پھر اللہ کے رسول کی یہ حدیث سنائی کہ سید الشہداء ایک تو حمزہ بن عبد المطلبؓ ہیں اور دوسرا ہر وہ شہید جو ظالم حکمراں کے سامنے کھڑا ہو، اُسے ظلم سے روکے اور اس کے نتیجہ میں مار دیا جائے۔[۸] اپنی حق گوئی اور حکم رانوں کے غلط رویوں کی تائید سے انکار کے رویے کی وجہ سے امام صاحب کو تین حکم رانوں کے دور میں قید وبند اور کوڑوں کی مار کا ظلم سہنا پڑا، یہاں تک کہ قید کے دوران ہی اُن کی موت ہوگئی جو بعض سوانح نگاروں کے نزدیک اُس زہر کا نتیجہ تھی جو حکم رانوں نے دوران قید ان کے کھانے میں شامل کر دیا تھا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے آزادی اظہار رائے کا سودا کرنے سے انکار کیا۔ کئی برس جیل میں قید رہے، یہاں تک کہ دمشق کے قید خانے ہی سے آپ کا جنازہ اٹھا۔ مجدد الف ثانیؒ کو گوالیار کے قلعہ میں قید رہنا پڑا۔ قریبی دور میں مغربی استعمار کے مظالم کے خلاف جدوجہد، عالم اسلام کے ہر خطہ میں زعمائے اسلام کا نشان امتیاز رہا ہے۔ ہمارے ملک کی آزادی کی تاریخ بھی سید احمد شہیدؒ، سید اسماعیل شہیدؒ، مولانا محمود حسنؒ وغیرہ کی عظیم قربانیوں کے تذکرے کے بغیر کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔

بیسویں صدی کے نصف آخر اور اکیسویں صدی کے اوائل کی تاریخ، اسلامی تحریکوں کی ظلم کے خلاف بھرپور مزاحمت اور اس کے لیے بے نظیر قربانیوں کی تاریخ ہے۔ حسن البنا شہیدؒ کی عین جوانی میں شہادت، سید قطب شہیدؒ کی پھانسی، مولانا مودودیؒ کی طویل قید، اور اخوان المسلمون، فلسطین کی تحریک مزاحمت اور دنیا کے مختلف ملکوں میں ظالموں کے مقابلہ میں اسلامی تحریکوں کی صبر و استقلال کے ساتھ حوصلہ مند جدوجہد، اسلامی تاریخ کا سرمایہ افتخار ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ظلم کے خلاف مزاحمت کی اس قدر کثیر اور ایسی مسلسل مثالیں، کسی اور قوم یا مذہب کی تاریخ میں نہیں ملتیں۔

مزاحمت: مسلح یا پر امن؟

طاغوت کی ظالمانہ قوت کے مقابلہ اور اُس کے فتنہ و فساد کو ختم کرنے کے لیے کی جانے والی جدوجہد کو قرآن جہاد کہتا ہے اور اسے اہل اسلام کا ایک اہم فریضہ قرار دیتا ہے۔ جہاد کے بارے میں یہ بات اسلامی احکام میں بڑی وضاحت کے ساتھ موجود ہے کہ اُس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ جہاد پر امن مزاحمت کے روپ میں بھی ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں شریعت کی دی ہوئی شرطوں کے مطابق مسلح جنگ کے روپ میں بھی۔ جہاد کی شکلیں حالات کے لحاظ سے متعین ہوتی ہیں لیکن ظلم و استحصال کے خلاف جدوجہد ایک ایسا فریضہ ہے جو ہر حال میں اہل اسلام پر عائد ہوتا ہے۔

اسلام حکم رانوں کو اس بات کا پابند کرتا ہے کہ وہ بشرط قوت، ظلم کے خاتمہ کے لیے قتال کریں اور قوت کا استعمال کریں۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا

(آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کم زور پاکر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مدد گار پیدا کر دے۔ سورہ نساء، آیت ۷۵)

ظلم کے خلاف مسلح جدوجہد، عام طور پر حکومتوں کی ذمہ داری ہے۔ مسلح جہاد کی شرطوں پر گفتگو اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔ اس لیے اس کی تفصیلات سے قطع نظر، جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق ہے، اکثر صورتوں میں، اسلام انھیں اس بات کا پابند کرتا ہے کہ وہ ظلم کے خلاف پر امن مزاحمت کریں۔ خاص طور پر اگر ظلم، جان و مال پر راست حملہ کی صورت میں نہ ہو بلکہ حقوق کو غصب کرنے کی صورت میں ہو تو مزاحمت پر امن ہی ہونی چاہیے۔

مزاحمت اگر پر امن ہو تو مزاحمت کاروں کو اخلاقی برتری حاصل ہو جاتی ہے۔ موجودہ جمہوری معاشروں میں رائے عامہ کو اجتماعی امور میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ امن، تشدد سے گریز اور ظالم حریفوں کی جانب سے اُن پر تشدد کے یک طرفہ سلسلے، دھیرے دھیرے رائے عامہ کو مزاحمت کاروں کے حق میں بدلنے لگتے ہیں۔ اس اخلاقی فتح سے ظلم کو شکست دینے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

پر امن مزاحمت کے نتیجہ میں تحریک زیادہ عوامی ہو جاتی ہے۔ شامل ہونے والے افراد کے لیے رسک کم ہوتا ہے اس لیے وہ زیادہ بڑے پیمانے پر شامل ہونے لگتے ہیں۔ ایسی تحریک زیادہ تیزی سے پھیلتی ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ موجودہ دور میں کسی پر امن مزاحمت کی کام یابی کے امکانات،

پر تشدد مزاحمت کے مقابلہ میں کم سے کم دس گنا زیادہ ہیں۔ ایک جائزے کے مطابق ۱۹۰۰ سے ۲۰۱۵ تک دنیا بھر میں پچاس فی صد سے زیادہ پر امن تحریکات کام یاب رہی ہیں جب کہ پر تشدد تحریکوں کی کام یابی کی شرح بہت کم ہے۔[9]

جدید دور میں ریاستوں کے پاس، ترقی یافتہ اسلحہ، منظم فورس اور کمیونکیشن اور حمل و نقل پر غیر معمولی کنٹرول کی صورت میں بے پناہ قوت موجود ہوتی ہے۔ عام لوگوں کے لیے اس کا مقابلہ ممکن نہیں ہوتا لیکن ریاست اور اس کی قوت بھی رائے عامہ کے سامنے مجبور ہوتی ہے۔ اس لیے پر تشدد تحریک کی کام یابی کے امکانات کم ہوتے ہیں۔

پر تشدد تحریک کو منتشر کرنا نہایت آسان ہوتا ہے جب کہ پر امن تحریک آسانی سے ختم نہیں ہوتی۔ وہ مسلسل جاری رہتی ہے اور نئے نئے روپ اختیار کرتی رہتی ہے۔ اس کے تسلسل کی وجہ سے سماج کے بااثر عناصر بھی دھیرے دھیرے ظالم قوتوں کا ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں۔

اگر معمولی درجہ کا بھی تشدد شامل ہو جائے تو اس سے تحریک کو کچلنا اور ختم کرنا نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ اس لیے موجودہ دور میں دنیا کی ظالم قوتیں خود یہ کوشش کرتی ہیں کہ اُن کے خلاف تحریک مزاحمت پُر تشدد ہو جائے یا اس میں متشدد عناصر داخل ہو جائیں جو خون خرابے کی طرف تحریک کو موڑ سکیں۔

اسلام نے عام لوگوں کے لیے، عام حالات میں اپنے حقوق کے حصول کے لیے مسلح کوششوں کو پسند نہیں کیا ہے بلکہ پر امن مزاحمت کو ترجیح دی ہے۔ بعض مصنفین نے تو یہ بات تک لکھی ہے کہ گاندھی جی نے عدم تشدد پر مبنی مزاحمت کا جو ماڈل دیا تھا وہ اسلام سے متاثر تھا۔[10]

پر امن مزاحمت کے جو طریقے اور اصول ہم کو اسلام کی تعلیمات میں ملتے ہیں، ان کی کچھ تفصیل نیچے درج کی جا رہی ہے۔

پر امن مزاحمت کی پہلی اور بنیادی شکل یہ ہے کہ ظلم کو ظلم کہا جائے۔ حکم رانوں کو ظلم سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔ اُن کے غلط رویوں پر تنقید کی جائے اور اس بات کی پروانہ کی جائے

کہ اس حق گوئی کے نتیجہ میں کن مصائب ومشکلات کا سامنا ہو سکتا ہے۔

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ۔
(نبی کریم ﷺ نے فرمایا: افضل جہاد ایک ظالم حکمران کے سامنے سچی بات کہنا ہے۔)[۱۱]

عام حالات میں شریعت نے اس بات کو پسند نہیں کیا ہے کہ لوگوں کی برائی علانیہ بیان کی جائے یا اس کا چرچا کیا جائے لیکن مظلوم کو اس کی اجازت دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا عَلِيمًا۔ (النساء۔۱۴۸) (خدا اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی کسی کو علانیہ برا کہے مگر وہ جو مظلوم ہو۔ اور خدا (سب کچھ) سنتا (اور) جانتا ہے۔)

تفسیر احسن البیان میں اس کی تشریح میں کہا گیا ہے:

شریعت نے تاکید کی ہے کہ کسی کے اندر برائی دیکھو تو اس کا چرچا نہ کرو بلکہ تنہائی میں اس کو سمجھاؤ۔ اسی طرح کھلے عام اور علی الاعلان برائی کرنا بھی سخت ناپسندیدہ ہے۔ ایک تو برائی کا ارتکاب ویسے ہی ممنوع ہے، چاہے پردے کے اندر ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرا اسے سرعام کیا جائے یہ مزید ایک جرم ہے۔ البتہ اس سے الگ ہے کہ ظالم کے ظلم کو تم لوگوں کے سامنے بیان کر سکتے ہو۔ جس سے ایک فائدہ یہ متوقع ہے کہ شائد وہ ظلم سے باز آجائے اور اس کی تلافی کی سعی کرے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے لوگ اس سے بچ کر رہیں۔

بعض لوگوں نے اس آیت سے احتجاج کے جدید طریقوں کے حق میں استدلال کیا ہے۔ علامہ ابن کثیرؒ نے اسی آیت کی تشریح میں وہ مشہور واقعہ نقل کیا ہے جو احتجاج کی جدید شکلوں سے بہت قریب ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص نے اپنے پڑوسی کے خراب رویہ اور اس کی جانب سے پہنچنے والی اذیتوں کی شکایت کی۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ آپ نے اسے صبر کی تلقین کی۔ متعدد دفعہ شکایات سننے کے بعد — ابوہریرہؓ سے مروی روایت میں کہا گیا ہے — آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ اپنا سامان لے کر راستے پر آجاؤ۔ راوی کہتے ہیں لوگ راستے سے گزرتے اور اس پر (پورا واقعہ سن کر

پڑوسی کو تکلیف پہنچانے والے پر) لعنت کرتے۔ (یہاں تک یہ خبر ستانے والے پڑوسی تک پہنچی اور اسے معلوم ہوا کہ ہر طرف لوگ اس کو لعنت ملامت کر رہے ہیں تو) اس نے خود آکر اپنے پڑوسی کا سامان اٹھایا اور کہا ارْجِعْ لَا تَرَى مِنِّي شَيْئًا تَكْرَهُهُ واپس چلیے آئندہ آپ کو مجھ سے کوئی ناگوار بات دیکھنے کو نہیں ملے گی۔[۱۲]

ظلم کی موجودہ شکل

قارئین یہ بات سمجھ ہی چکے ہوں گے کہ اس بحث کا اصل پس منظر احتجاج و مزاحمت کا وہ سلسلہ ہے جو اس وقت ہمارے ملک میں جاری ہے۔ اب یہ بات بہت واضح ہو کر سامنے آگئی ہے کہ فرقہ پرست قوتیں اس ملک کے مسلمانوں پر مختلف طریقوں سے عرصہ حیات تنگ کرنا چاہتی ہیں اور بالآخر ان کی شہریت کو مشکوک بنانا چاہتی ہیں۔ ہم نے اپنی کتاب 'بدلتی ہوئی دنیا اور اسلامی فکر' میں تفصیل سے بحث کی ہے کہ ہر ظالم کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ علانیہ یا پوشیدہ طور پر اور شعوری یا غیر شعوری طور پر، انسانوں کی تقسیم کے فلسفہ میں یقین رکھتا ہے۔[۱۳] انسانوں کو تقسیم کرکے کچھ انسانوں کو ذات، رنگ، نسل، یا طبقہ کی بنیاد پر 'اپنا' یا اپنے جیسا سمجھا جاتا ہے اور باقی کم زور انسانوں کو 'غیر' سمجھا اور باور کرایا جاتا ہے۔ ہمدردی اور انسانیت کے سارے جذبات 'اپنوں' تک محدود کرا لیے جاتے ہیں۔ 'غیر' کے سلسلہ میں جذبات ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے عام طور پر جانوروں کے سلسلہ میں ہوتے ہیں۔ ان کی موت یا انھیں لاحق اذیتوں پر کسی حساس دل آدمی کو درد ہو بھی تو بس اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کسی جانور کی تکلیف پر ہو سکتا ہے۔ ظلم کی اس نفسیات پر بھی قرآن مجید نے روشنی ڈالی ہے۔

> إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ. وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ. وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ۔ (واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا، اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے

دیتا تھا فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انھیں پیشوا بنادیں اور انھی کو وارث بنائیں۔ اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں اور ان سے فرعون وہامان اور ان کے لشکروں کو وہی کچھ دکھلا دیں جس کا انھیں ڈر تھا۔سورہ قصص، آیت ۴)

اس طرح شہریت کے غیر منصفانہ قوانین اور اس کے ثبوت طلب کرنے کے نامعقول طریقوں کا ایک مقصد ملک کے عوام کے درمیان اس تفریق کو پیدا کرنا اور اس کے ذریعے ظلم کی راہ ہموار کرنا ہے اور دوسرا مقصد اسلام کی نظریاتی طاقت کے آگے بند باندھنا ہے۔ اس وقت اسلام مخالف طاقتوں پر اسلام سے خوف یا اسلاموفوبیا کا جو اثر ہے، اس کی وجہ سے وہ اسلام کے وجود کو کم زور سے کم زور تر کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ چاہتے ہیں کہ بالآخر، شہریت اور بنیادی حقوق، اسلام اور اسلامی تشخص سے دستبرداری کے ساتھ مشروط ہوجائیں۔ یہ دھمکی کہ ہمارے درمیان رہنے کے لیے تمھیں اپنا دین بدلنا ہوگا، اسلام کے مقابلہ میں باطل طاقتوں کا بہت پرانا حربہ ہے۔ شعیب علیہ السلام کی قوم کے بارے میں کہا گیا۔ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِن قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا۔ (اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، اس سے کہا کہ "اے شعیب، ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔سورہ اعراف، آیت ۸۸) لوط علیہ السلام کی قوم نے بھی یہی دھمکی دی: فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَن قَالُوا أَخْرِجُوا آلَ لُوطٍ مِّن قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ۔ (مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا "نکال دو لوط کے گھر والوں کو اپنی بستی سے، یہ بڑے پاکباز بنتے ہیں۔سورہ نمل، آیت ۵۶)

خود نبی کریم ﷺ کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔ وَإِن كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذًا لَّا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا۔ (اور یہ لوگ اس بات پر بھی تلے رہے ہیں کہ تمہارے قدم اِس سر زمین سے اکھاڑ دیں اور تمھیں یہاں سے نکال باہر کریں لیکن اگر یہ ایسا کریں

گے تو تمہارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھیر سکیں گے۔سورہ بنی اسرائیل، آیت ۷۶)

تحریک اسلامی اور ظلم کی مزاحمت

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ صورت اہل اسلام کے لیے کوئی نئی آفت نہیں ہے۔ ظلم کی اس شکل اور دیگر شکلوں سے اکثر انبیا علیہم السلام کا سامنا ہوا۔ انھوں نے اس کے مقابلہ میں جس رد عمل کا مظاہرہ کیا وہی ہمارا بھی رد عمل ہونا چاہیے۔

ہم اوپر کی سطروں میں واضح کر چکے ہیں کہ انبیا علیہم السلام نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ ظلم کو صاف صاف ظلم کہا۔ ظالم کو روکنے کی جو ممکن کوشش ہوسکتی تھی وہ کوشش کی۔ یہ کوشش ان کے مشن کا تقاضا تھی۔ جس دعوت کے وہ علم بردار تھے اُس کی عملی شہادت کا ذریعہ تھی۔

آج بھی اسلامی تحریک اپنے اطراف واکناف ہورہے ظلم سے بے خبر اور بے تعلق نہیں رہ سکتی۔ یہ اس کے مزاج و منہج کے خلاف بات ہوگی۔ خاموشی اور لاتعلقی ایک معکوس عملی شہادت ہوگی، جو اُن اصولوں اور قدروں سے متصادم ہوگی جن کی تحریک داعی ہے۔ اسلامی تحریک کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ صاف صاف ظلم کو ظلم کہے۔ اُسے بے نقاب کرے۔ اس کے خلاف رائے عامہ ہموار کرے۔ ظلم کے خلاف یہ واضح موقف تحریک کی اصولی دعوت کی تفہیم و تشریح اور اس کے ذریعے رائے عامہ کی تربیت کا بھی ذریعہ ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ظلم اور حق تلفی کے خلاف یہ مزاحمت لازماً پر امن اور ہر طرح کے تشدد سے پاک ہوگی۔ تحریک نہ تو خود کسی بھی طرح کے تشدد کا کسی حال میں حصہ بنے گی اور نہ تشدد پر مبنی کسی تحریک سے اپنا رشتہ جوڑے گی۔ اور یہ احتیاط بھی کرے گی کہ اس کی تحریک کو شر پسند عناصر پُر تشدد رخ نہ دینے پائیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ تحریک کی اصل دعوت اسلام کی دعوت ہے۔ ظلم کے خلاف مزاحمت میں بھی وہ نہ کوئی ایسی بات کہے گی اور نہ کوئی ایسا عملی رویہ اختیار کرے گی جو اسلام کی تعلیمات سے متصادم ہو۔ جنگ کے دوران بھی قبائلی عصبیتوں پر مبنی جاہلی نعروں کو اللہ کے

رسول ﷺ نے پسند نہیں فرمایا۔

وَمَنْ قَاتَلَ تَحْتَ رَايَةٍ عِمِّيَّةٍ يَغْضَبُ لِعَصَبَةٍ، أَوْ يَدْعُو إِلَى عَصَبَةٍ، أَوْ يَنْصُرُ عَصَبَةً، فَقُتِلَ، فَقِتْلَةٌ جَاهِلِيَّةٌ۔ اور جس نے اندھیرے میں رہتے ہوئے انجانے پرچم تلے جنگ کی، عصبیت کی وجہ سے غصہ میں آیا، یا جس نے عصبیت کی طرف دعوت دی، یا جس نے عصبیت کے کام میں مدد کی اور مارا گیا وہ جاہلیت کی موت مرا۔[۴۱] دشمنوں کے ساتھ بھی ناانصافی سے باز رہنے کی قرآن نے تاکید کی۔ (سورہ مائدۃ، آیت ۸) یہ انتہائی احتیاط ضروری ہے کہ ظلم کے خلاف مزاحمت فرقہ وارانہ کش مکش میں نہ بدلے اور تحریک ایک فرقہ پرست گروپ کی صورت میں سامنے نہ آئے اور نہ ہی ایسا ہو کہ دیگر امن پسند سیکولر طاقتوں سے تعاون و اشتراک کے نتیجہ میں ہماری اصولی دعوت گم ہو جائے اور ہم طبقاتی کش مکش کے ایک فریق بن جائیں۔ ہم نہ فرقہ پرستی کو صحیح سمجھتے ہیں اور نہ طبقاتی کش مکش کو۔ ہم سارے انسانوں کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں اور ایک خدا کی بندگی کے داعی ہیں۔ اس حقیقت پر ایک لمحہ کے لیے بھی پردہ پڑتا ہے تو یہ تحریک کے لیے باعث نقصان ہوگا۔

چوتھی اور نہایت اہم بات یہ ہے کہ ظلم کی مزاحمت، تحریک کے اصل اور مستقل کام میں اضمحلال یا اس سے انحراف کا ذریعہ نہ بننے پائے، یہ احتیاط بھی سختی سے ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اسلام مخالف طاقتوں کی ریشہ دوانیوں اور شرارتوں کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ حق و انصاف کی حامل قوتیں ان میں الجھ کر رہ جائیں اور اپنے اصل کام سے غافل ہو جائیں۔ اللہ کے دین کی دعوت، امت مسلمہ کی اصلاح اور اس کی تعمیر و ترقی کی کوشش اور انسانوں کی خدمت اور ان کے دلوں کو جیتنے کی کوشش، تحریک اسلامی کا مستقل ایجنڈا اور اس کا اصل کام ہے۔ حقیقی، مکمل اور پائیدار عدل، اسی راستہ پر صبر و استقامت کے ساتھ آگے بڑھنے کے نتیجہ میں حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس بات کو یقینی بنانا ضروری ہے کہ راستہ کی وقتی رکاوٹیں، اصل راستہ سے منحرف نہ کرنے پائیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو نسل پرستانہ تعذیب پر مبنی، ظلم کی نہایت بدترین صورت حال کے درمیان بھی جو اصل کام دیا گیا تھا وہ دعوت الی اللہ ہی کا کام تھا چنانچہ حکم دیا گیا کہ اذْهَبْ أَنْتَ وَأَخُوكَ بِآيَاتِي

وَلَا تَنِیَا فِی ذِکْرِی۔ (تم اور تمہارا بھائی (ہارون) میری نشانیاں لے کر جاؤ اور میرے ذکر میں سستی نہ کرنا۔ سورہ طہٰ، آیت ۴۲) نبی کریم ﷺ کو بار بار تاکید کی گئی کہ لوگوں کی ایذا رسانیوں کی پروا کیے بغیر آپ دعوت حق کا کام انجام دیتے رہیں۔ اور آپ ﷺ کا اسوہ بھی یہی ہے کہ چاہے شعب ابی طالب کی گھاٹی ہو یا ہجرت کا صبر آزما سفر، آپ کی دعوتی جدوجہد کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی کم زور نہیں ہوئی۔ آج بھی ہمارے لیے یہی راستہ ہے کہ ظلم کے خلاف، ہم آواز لازماً بلند کریں اور اس کا بھرپور مقابلہ بھی کریں لیکن اپنے اصل اور بنیادی کام سے کبھی دست بردار نہ ہوں۔

(زندگی نو، فروری ۲۰۲۰)

حواشی و حوالہ جات

۱۔ تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورہ شوریٰ، حاشیہ ۶۳

۲۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم، دار الجیل، بیروت، ۲۰۰۵، ص ۲۳۴

۳۔ سنن الترمذی، ابواب الفتن عن رسول اللہ، باب ماجاء فی نزول العذاب، رواہ ابو بکر الصدیقؓ، صححہ الالبانی

۴۔ سنن ابی داود، کتاب الملاحم، باب الامر والنھی، رواہ عبد اللہ بن مسعودؓ

۵۔ صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، رواہ خباب بن الارتؓ

۶۔ طبقات ابن سعد ۱۲۹/۱

۷۔ البدایۃ و النہایۃ، الجزء السابع، غزوۃ القادسیۃ

۸۔ رواہ الحاکم ۲۱۵/۳، و صححہ الالبانی

۹۔ اس موضوع پر گہرائی سے مطالعہ کے لیے ملاحظہ فرمایئے ایک دل چسپ کتاب

Chenoweth Erica and Stephen Maria J., *Why Civil Resistance Works: The Strategic Logic of Non-Violent Conflict*, Columbia University Press, New York, 2011

Chenoweth Erica and Stephen Maria J.,"How the World is Proving Martin Luther..." in *Washington Post*, January 18, 2016

۱۰۔ Chatterjee Margaret, Gandhi and the Challenge of Religious

Diversity, Promilla and Co Publishers, New Delhi, 2005, pages 119 onwards.

۱۱ سنن ابی داود، کتاب الملاحم، باب الامر والنھی، رواہ ابو سعید خدریؓ، وصححہ الالبانی

۱۲ سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی حق الجوار، الالبانی حسن صحیح۔ اور ابن کثیر (تحقیق: سامی بن محمد السلامہ)، تفسیر القرآن العظیم، الجزء الثانی، دار طیبۃ لنشر والتوزیع، الطبعۃ الثانیۃ، الریاض، الجزء الثانی، ص٤٤٤

۱۳ سید سعادت اللہ حسینی، بدلتی ہوئی دنیا اور اسلامی فکر، ہدایت پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۹، ص۸۰ تا ۸۵

۱۴ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب الامر بلزوم الجماعۃ عند ظھور الفتن، رواہ ابو ھریرۃ

سازشیت، سازشی نظریات اور اسلامی فکر

مشکل اور پرخطر حالات طرح طرح کے نظریاتِ سازش (conspiracy theories) کے لیے زرخیز زمین فراہم کرتے ہیں۔اس وقت اسلامی دنیا میں جس تیزی سے فتنوں اور آزمائشوں کا سلسلہ بڑھتا جارہا ہے، اہل اسلام کے درمیان ایسے نظریات کی مقبولیت بھی بڑھتی جارہی ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں وہ کیفیت بھی نظر آرہی ہے جسے ماہرین سماجیات سازشیت (conspiracism) کہتے ہیں، یعنی یہ شعوری یا غیر شعوری عقیدہ کہ تاریخ کو بنانے اور بگاڑنے میں کلیدی کردار چند طاقت ور لوگوں کی خفیہ سازش کا ہوتا ہے۔

سازش انسانی زندگی اور سماج کی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ روزمرہ کی عام زندگی سے لے کر عالمی سطح کے اہم معاملات تک، ہر سطح پر یقیناً سازشیں ہوتی ہیں۔ شیطان بنیادی طور پر ایک سازشی کردار ہے۔ (قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ: شیطان نے کہا: تیری عزت کی قسم، میں اِن سب لوگوں کو بہکا کر رہوں گا۔ سورہ ص، آیت ۸۲) چنانچہ ہر زمانے میں شیطان کے پیروکار سازش کرتے رہے ہیں۔ مکر وفریب اور سازش بعض لوگوں کے مزاج کا حصہ ہوتی ہے اسی طرح بعض اجتماعی گروہ بھی سازشی سوچ اور طبعیت کی بنیاد پر اس طرح تشکیل پاتے ہیں کہ یہ ان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ وہ آئے دن سازش کرتے رہتے ہیں۔ بعض سازشیں کام یاب بھی ہوتی ہیں اور بعض ناکام بھی۔ فسادی قوتوں کی سازشوں سے باخبر رہنا اور اُن کو ناکام بنانے کی حکمت عملی تیار کرنا، دنیا میں خیر وصلاح کے فروغ کی اہم ضرورت اور تقاضا ہے۔ اس حد تک سازشوں کو زیر بحث لانا، اُن کا تجزیہ کرنا اور اُن کے مقابلہ کی تدابیر ڈھونڈنا، ایک اہم ضرورت ہے

اور دنیا بھر کے بہت سے سنجیدہ دانش وروں اور تجزیہ نگاروں کی تحریروں میں سازشوں کے بارے میں متوازن بحث ملتی ہے۔

لیکن جس انتہاپسندانہ سوچ اور زاویہ فکر کو سازشیت (conspiracism) کہا جاتا ہے، وہ ان سنجیدہ مباحث سے مختلف ہے۔ اس زاویہ فکر کے حاملین، دنیا کے ہر چھوٹے بڑے واقعے کو سازش کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اُن کی سوچ کے مطابق تاریخ کا اصل فیصلہ کُن ایجنٹ ایک نظر نہ آنے والا امکار سازشی گروپ ہوتا ہے۔[1] اس سوچ کے شکار لوگ، کسی بھی واقعے یا حادثے کو، اُس کی ظاہری صورت میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ چنانچہ زلزلہ، طوفان، سونامی، وائرس کی وبا، ٹڈی دلوں کا حملہ جیسی اجتماعی آفتیں ہوں یا کینسر، ایڈس، سڑک حادثات جیسی انفرادی مصیبتیں، ہر چیز کو وہ سازش کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور سازش بھی ایک ہی نہایت طاقت ور گروہ کی جو ساری دنیا کو کنٹرول کرنا چاہتا ہے۔ دنیا میں بھلائی کے جو کام ہوتے ہیں اُن کے ڈانڈے بھی وہ اسی عالمی سازش سے ملاتے ہیں۔ چنانچہ ماحولیات کے تحفظ کی کوشش ہو یا بعض بیماریوں کی روک تھام کی مہم، ہر چیز کو وہ اسی عالمی سازش کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ دنیا میں خیر اور بھلائی کا کوئی وجود اور کوئی امکان وہ نہیں دیکھ پاتے۔ ہر بااختیار فرد اور ادارہ، اُن کے نزدیک یا تو مجسم شر ہوتا ہے یا شر کا ایجنٹ و آلہ کار۔

نظریات سازش صرف مسلمانوں یا تیسری دنیا میں رائج نہیں ہیں بلکہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی ان کا چلن ہے بلکہ اکثر نظریات وہیں سے درآمد ہوتے ہیں۔ الیومیناٹی اور فری میسن وغیرہ سے متعلق اکثر مافوق الفطری تصورات، مغربی ممالک ہی سے درآمد ہوئے ہیں۔[2] اسلامی روایات سے ہٹ کر مسیح دجال اور آخر زمان سے متعلق، جو تصورات اور پیشین گوئیاں وقتاً فوقتاً ہمارے حلقوں میں گردش کرتی ہیں، اُن کا سرچشمہ بھی دقیانوسی عیسائیت کے اینٹی کرائسٹ (Antichrist) اور اینڈ ٹائم (End time) کے تصورات ہیں۔ امریکہ و یورپ میں آج بھی بہت سے لوگ زمین کو مسطح مانتے ہیں، چاند پر انسان کے قدم رکھنے کے واقعہ کو فریب سمجھتے ہیں، موسمی تبدیلی اور ماحولیاتی بحران کو جھوٹ اور مفادات حاصلہ کی گھڑی ہوئی سازش تسلیم کرتے ہیں، ٹیکوں (vaccination)

کو نقصان دہ اور کسی بھیانک سازش کا حصہ باور کرتے ہیں۔ ہٹلر کے عروج کے زمانے میں یہ تصور عام تھا کہ وہ مسیح دجال ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ عیسوی سن ۶۱۴ سے ۹۱۱ کے درمیان کا عرصہ (رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے بعد سے یورپ کی اسلامی فتوحات تک کا تقریباً تین سو سال کا عرصہ) سرے سے وقوع پذیر ہی نہیں ہوا اور ان برسوں کے دوران کی ساری تاریخ جعلی ہے۔[۳] جس طرح بعض مسلمان ہر مسئلہ کے لیے یہودیوں کو ذمہ دار سمجھتے ہیں اسی طرح مغربی ملکوں میں، ایسے بے شمار لوگ ہیں جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں (اس نظریہ کو یوریبیا [Eurabia] کہا جاتا ہے) کہ مسلمان نہایت مکار، ذہین اور بااثر قوم ہیں اور دنیا کے تمام احوال پر اس حد تک اثر انداز ہو رہے ہیں کہ بہت جلد پورے یورپ پر قابض ہونے والے ہیں اور اس سازش میں یورپ و امریکہ کے انتہائی بااثر حکمراں، دولت مند سرمایہ دار اور اہل علم وفن، مسلمانوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔[۴] یا یہ کہ بارک اوباما اصلاً مسلمان ہیں جنھیں مسلمانوں نے امریکہ پر قبضہ کرنے کے لیے منصوبہ بند طریقہ سے امریکی نظام میں داخل کرایا ہے، یا وہ مسیح دجال ہیں۔ اب یہ تصور بھی عام ہونے لگا ہے کہ دجال دراصل اسلام اور کمیونزم کے اشتراک سے پیدا ہونے والی عالمی تحریک کا نام ہے۔[۵] وغیرہ۔

ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سازشی نظریات ہر قوم میں مقبول ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ معاشروں میں ان نظریات کو حاشیائی (fringe) اور مجنونانہ (paranoid) افکار مانا جاتا ہے لیکن ہمارے یہاں مین اسٹریم کے سمجھ دار لوگ بھی ان سے متاثر ہونے لگتے ہیں۔

سازشی نظریات کی تین قسمیں

ثبوت وصحت کے امکان کے اعتبار سے سازشی نظریات کی تین ممکنہ قسمیں ہوسکتی ہیں۔

ایک تو وہ نظریات ہیں جو ٹھوس دلائل وشواہد کے ساتھ ثابت شدہ ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ عراق جنگ کا مقصد عام تباہی کے ہتھیاروں کا اتلاف نہیں بلکہ تیل کے ذخائر پر کنٹرول تھا، اب ناقابل تردید شواہد (مثلاً چلکوٹ رپورٹ[۶]) کے ساتھ سامنے آچکی ہے۔ مختلف فسادات کی معتبر تحقیقاتی رپورٹیں موجود ہیں جو فسادات کی سازشوں کو بے نقاب کرتی ہیں۔ یہ بات کہ مسلمانوں میں ماڈریٹ اسلام

کے نام سے گمراہی اور قرآن و سنت سے دوری پیدا کرنے کی منصوبہ بند کوشش ہو رہی ہے، متعدد دستاویزی شہادتوں کے ساتھ ثابت شدہ ہے۔ سرمایہ دارانہ استعماری قوتوں کے سازشی تجارتی و معاشی ہتھکنڈے، ذرائع ابلاغ کی جانب سے جھوٹ پھیلانے اور اباحیت وصارفیت زدہ تہذیب کے فروغ کی کوششیں وغیرہ بھی وہ سازشیں ہیں، جن کا سازش ہونا ٹھوس علمی طریقوں سے معلوم ہے۔ مشکل یہ ہے کہ عام طور پر ایسی ناقابل تردید شہادتیں، واقعہ کے کافی عرصہ بعد حاصل ہو پاتی ہیں لیکن ان شہادتوں اور اُن کی تفصیلات کو سامنے رکھ کر آئندہ پیش آنے والے واقعات کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔

دوسری قسم اُن واقعات کی ہے جن میں سازش کا عنصر ثابت شدہ تو نہیں ہوتا لیکن اس کے سلسلے میں مضبوط شواہد موجود ہوتے ہیں، واقعات کی ظاہری شکل اور ان کی سرکاری توجیہ کی بنیادیں بہت کم زور ہوتی ہیں اور سرکاری موقف پر بہت سے سوالات کھڑے ہوتے ہیں۔ مثلاً گیارہ ستمبر کے واقعات کے سلسلہ میں امریکی حکومت کے موقف پر بہت سے سوالات لوگوں نے کھڑے کیے ہیں۔ ہمارے ملک میں دہشت گردی کے اکثر واقعات کے سلسلہ میں، سرکاری بیانیوں پر ذمہ دار اہل علم اور اعلیٰ عہدے داروں نے شکوک کا اظہار کیا ہے۔ ان واقعات کی توجیہ کے لیے جو متبادل نظریات پیش کیے جاتے ہیں گو کہ وہ بھی ثابت شدہ نہیں ہیں لیکن سرکاری بیانیہ بھی مشکوک ہے۔ اس لیے سازش کا اچھا خاصا امکان موجود ہے۔ ایسے واقعات کے سلسلہ میں سوالات اٹھائے جانے چاہییے۔ متبادل بیانیوں کا تجزیہ ہوتے رہنا چاہیے اور حقیقت کی تلاش جاری رہنی چاہیے۔

ان دو قسموں کو ہم معقول نظریات کہیں گے۔ ان معقول نظریات کی خصوصیت یہ ہے کہ اس طرح کی سازشوں کی مثالیں تاریخ کے ہر دور میں ملتی ہیں۔ جنگ اور فساد وغیرہ، انسانی عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ تاریخ کے ہر دور میں، مفادات کی خاطر جنگیں لڑی گئیں اور ان کے لیے حقیقی اسباب سے ہٹ کر، مصنوعی اسباب کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس لیے آج بھی ان کا بھرپور امکان ہے۔ ان سازشوں کا اثر محدود ہوتا ہے۔ محدود تعداد میں افراد متاثر ہوتے ہیں یا محدود علاقہ تک یا محدود وقت کے لیے اُن کا اثر ہوتا ہے۔ ایسی سازشوں کو بروئے کار لانے کے لیے مافوق البشر قوتوں کی یا

عالمی سطح کے اتفاق رائے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ یہ عام قوانین فطرت کے مطابق روبہ عمل لائی جاتی ہیں۔ ان کو بے نقاب کرنا اور ان کا مقابلہ کرنا ممکن ہوتا ہے۔ ایسی سازشوں سے یقیناً خود بھی باخبر رہنا چاہیے اور لوگوں میں بھی بیداری لانا چاہیے اور فیصلہ واقدام کرتے ہوئے اُن کو اور ان سے حاصل شدہ اسباق کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اس وقت یہ معقول نظریات زیر بحث نہیں ہیں۔ بلکہ تیسری قسم زیر بحث ہے، جسے ہم نامعقول نظریات (irrational theories) کہیں گے۔ یہ وہ نظریات ہیں جو بغیر کسی ٹھوس علمی وعقلی بنیاد کے، محض اٹکل پر مبنی ہوتے ہیں اور سماجی رابطہ کے ایپ اور سوشل میڈیا کے ذریعے، غیر معروف ویب سائٹوں کے ذریعے یا سنسنی پسند صحافت اور ٹیبلائڈ کے ذریعے عام ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں مین اسٹریم صحافت بھی ان کی ترویج کا ذریعہ بنتی رہتی ہے، نیز جذباتی خطیبوں اور ناپختہ مصنفین کے ذریعے بھی یہ عوام میں مقبول ہوتے ہیں۔

نامعقول سازشی نظریات کے نقصانات

نامعقول سازشی نظریات کے کئی سماجیاتی، نفسیاتی اور عملی نقصانات ہیں۔ سب سے بڑا عملی نقصان یہ ہے کہ تجزیہ کی یہ غلطی ہماری اسٹریٹجی اور عملی اقدامات کا رخ بگاڑ دیتی ہے۔ ہم پر اثر انداز ہونے والے واقعات بہت سے پیچیدہ اندرونی وبیرونی اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ متعدد دشمنوں کی ظاہری وپوشیدہ کوششیں ہوتی ہیں، ایسے اتفاقی واقعات وعوامل ہوتے ہیں جن پر کسی کا کنٹرول نہیں ہوتا، خود ہماری کمزوریاں، غلط فیصلے واقدامات، بے عملیاں اور کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ ان سب عوامل کے پیچیدہ باہمی تعامل کے نتیجہ میں کوئی خراب اور نقصان دہ صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ اس صورت حال کا معقول ردّعمل اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب ان سارے عوامل پر ہماری نظر ہو، ان کو ان کے صحیح تناسب اور تناظر میں دیکھا جائے، اُن کا دقیق تجزیہ ہو اور ان سب عوامل کو سامنے رکھ کر کسی حل کو ڈیزائن کیا جائے۔[ے] لیکن سازشیت سے متاثر سہل انگار مزاج، اس دقیق عمل کا متحمل نہیں ہوتا۔ ہر خرابی اور ہر مشکل ان کے نزدیک اُسی ایک مفروضہ سازشی قوت کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ بس ہلکی پھلکی ذہنی ورزش سے، واقعہ کی ظاہری شکل کو مشکوک بنادینا اور واقعہ کو اُس

سازشی قوت سے جوڑ دینا کافی ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ ذہن و مزاج درست تجزیوں کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے اور کبھی کسی ٹھوس اسٹریٹیجی یا عملی پروگرام تک پہنچنے نہیں دیتا۔

یہ ایک راہ فرار ہے۔ سنجیدہ، باعمل اور حوصلہ مند لوگ کبھی اس طرح کے فریب کا شکار نہیں ہوسکتے۔ جن لوگوں نے سازشیت کے نفسیاتی پہلوؤں پر کام کیا ہے[8] وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ عام طور پر ناکام لوگوں کی ذہنی ساخت اور شکست خوردگی کا نتیجہ ہوتی ہے۔[9] آدمی یا قومیں پے در پے ناکامیوں کے اثر سے جب بری طرح مجروح ہوجاتی ہیں اور عمل اور جدوجہد کی کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تو وہ نامعقول سازشی نظریات میں پناہ لینے لگتی ہیں۔

چوں کہ یہ نظریات اور ان کی بنیاد پر کیے جانے والے تجزیے کوئی عملی پروگرام تجویز نہیں کرتے اور نہ کسی عملی پروگرام پر منتج ہوپاتے ہیں، اس لیے یہ بے عملی اور تعطّل کو فروغ دیتے ہیں۔ ان میں یقین رکھنے والوں کے پاس، سوائے ان نظریات کی تکرار و تبلیغ کے، اور کوئی ٹھوس کام نہیں رہ جاتا۔ وہ ہر واقعہ میں سازش کا پہلو ڈھونڈنے اور اسے پھیلانے میں مصروف رہتے ہیں۔ سازشی عناصر کے ہمہ گیر استبداد کا تصور، ہر طرح کی عملی کاوش اور جدوجہد کو بے نتیجہ باور کراتا ہے اور منصوبہ بندی و حکمت عملی، سعی و کاوش اور مقابلہ و جدوجہد کا کوئی داعیہ باقی رہنے نہیں دیتا۔

یہ نظریات شدید قسم کی مایوسی کا نتیجہ ہوتے ہیں اور مایوسی و قنوطیت کو اور فروغ دیتے ہیں۔ جب آدمی یہ محسوس کرے کہ اس کے معاملات مکمل طور پر ایک ایسے اَن دیکھے دشمن کے کنٹرول میں ہیں جو دنیا کے تمام امور پر کنٹرول رکھتا ہے، تو وہ کس لیے جدوجہد کرے گا؟ عام طور پر یہ واقعات و حوادث ہی ہوتے ہیں جو تحقیق و تفتیش، اختراع و اپج اور جہد و سرگرمی کے لیے مضبوط محرک فراہم کرتے ہیں۔ لیکن اگر کسی کے ذہن پر سازشی نظریات چھائے ہوئے ہوں تو وہ کیوں مسئلہ کے (حقیقی) ظاہری اسباب کے پیچھے پڑے گا؟ وہ اسے ایک سازش سمجھے گا اور سازشیوں کو کوسنے کے سوا کوئی اور کام اس کے پاس نہیں بچے گا۔

سازشیت، سماجی تعلقات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ پراسراریت کا یہ لازمی تقاضا ہوتا ہے کہ

آدمی اپنے ہم مشربوں کے نہایت قریبی اور محدود ترین حلقہ کے سوا، باقی ساری دنیا کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ کسی بھی واقعہ و حادثہ کے ان اسباب کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا جن پر لوگ بھروسا کرتے ہیں۔ دیگر انسانوں کے ساتھ اس کی کوئی قدر مشترک تشکیل ہی نہیں ہو پاتی اس لیے کسی کے ساتھ بھی تعاون و اشتراک، یا مل کر کام کرنا یا معاملہ کرنا اس کے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔ جن باتوں پر انسانوں میں عام طور پر اتفاق رائے ہوتا ہے ان میں بھی اس کا زاویہ نظر بالکل مختلف ہوتا ہے۔

اس طرح کی سوچ عام طور پر قوموں میں اس وقت پننپنے لگتی ہے جب وہ زوال کی انتہا کو پہنچتی ہیں۔ [۱۰] بے بسی اور لاچاری جب عروج کو پہنچتی ہے تو قومیں ہر ایک کو اور ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتی ہیں۔ خود مسلمانوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ زوال کے ہر مرحلے میں اس طرح کے سازشی نظریات کو خوب فروغ ملا اور ان کے خوب چرچے ہوئے۔

سازشی نظریہ، درست یا نادرست؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کن نظریات کو معقول مانا جائے اور کن کو نامعقول؟ اس کے لیے جب ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو بڑی واضح روشنی ملتی ہے۔ ہم پہلے اس سلسلہ میں اس موضوع پر قرآن مجید کے مطالعہ کا حاصل پیش کریں گے اور پھر ایسے نظریات کی تنقیح کے جدید علمی طریقوں کا بھی تعارف کرائیں گے۔

سازشی نظریات اور اسلامی عقائد

قرآن مجید اپنے ماننے والوں کے ذہنوں کی تربیت اس طرح کرتا ہے کہ ایک بندہ مومن کسی غیر عقلی رویہ کا روادار نہیں ہوسکتا۔ توہم پرستی اور اندھی روایت پرستی، قرآن کے نزدیک مشرکانہ ذہن کی پیداوار ہے۔ اسی طرح پر اسراریت، اعجوبہ پرستی، نامعقول تشکیک اور بے بنیاد وہم وگمان بھی کم زور ایمان کے پھل ہیں۔ کھلی ہوئی حقیقتوں کو نظر انداز کر کے سربستہ اسرار کے پیچھے پڑنے کے اعجوبہ پرست مزاج کی قرآن سختی سے مذمت کرتا ہے۔ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ

السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمھیں علم نہ ہو یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے۔ سورہ اسراء، آیت ۳۶) قرآن جو مزاج پروان چڑھاتا ہے اس کے نتیجہ میں ایک بندہ مومن واقعات و حوادث اور معاملات زندگی کو اللہ کی آیات اور اس کی سنت نیز محکمات و تجربات کی روشنی میں دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔

قرآن کی روشنی میں کچھ ایسے اصول ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں جن سے سازشی نظریات کی تنقیح کے لیے ٹھوس بنیادیں میسر آتی ہیں۔

❑ فسادی اور فتنہ پرداز لوگ، نہایت کم زور ہوتے ہیں۔

نامعقول سازشی نظریات، اللہ کے نافرمان شر پسندوں اور فتنہ پردازوں کو بہت طاقت ور اور غیر معمولی قوت اور صلاحیت کے حامل باور کراتے ہیں بلکہ ان کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ ایک ایسی ہمہ گیر قوت کے مالک ہیں کہ ان کی مرضی اور منصوبہ بندی سے دنیا کے سارے واقعات انجام پاتے ہیں، گویا انھیں قادر مطلق (Omnipotent) اور عالم کل (Omniscient) مانا جاتا ہے۔ الیومیناٹی، فری میسن، صیہونیت بلکہ ہمارے ملک میں دائیں بازو کی فسطائی فرقہ پرستی، ان سب کے سلسلہ میں یہ تصورات موجود ہیں کہ ہر چھوٹا بڑا واقعہ انھی کی مرضی اور پلاننگ سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ سیاسی و معاشی امور سے لے کر سماوی آفات تک اور سائنسی و علمی تحقیقات سے لے کر اخلاقی و تہذیبی تصورات کے چلن تک، انسانی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں اُن کی مرضی کے بغیر کچھ ہو رہا ہو۔ وہ کبھی ناکام نہیں ہوتے اور نہ کبھی کوئی پتہ ان کی مرضی کے خلاف ہل پاتا ہے۔ وہ منصوبہ بندی کرتے ہیں اور دنیا کا ہر چھوٹا بڑا معاملہ، ان کے منصوبہ کے مطابق ہو بہو انجام پاتا ہے۔

جب کہ قرآن کہتا ہے کہ سازش کرنے والی شیطانی قوتیں بہت حقیر اور کم زور ہوتی ہیں، مکڑی کے جال سے بھی کم زور۔ سب سے بڑا اور سب سے طاقت ور سازشی تو شیطان مردود ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس کی سازشوں کے بارے میں فرماتا ہے کہ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ إِنَّ كَيْدَ

الشَّيطَانِ كَانَ ضَعِيفًا (پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کم زور ہیں۔سورہ نساء، آیت ۷۶) قرآن اللہ کے نافرمان بندوں کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ اپنی طاقت وصلاحیت کے بارے میں دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اِنِ الْكَافِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ (حقیقت یہ ہے کہ منکرین دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔سورہ ملک، آیت ۲۰) فرعون ونمرود جیسے طاقت ور بادشاہوں اور خدائی کے دعوے داروں کو بھی محدود اور ناقص اقتدار ہی ملا تھا۔ ان کی چالوں کا بھی ذکر کر کے قرآن یہ ابدی اصول بیان کرتا ہے کہ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (کافروں کی چالوں کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ مقصد تک نہ پہنچ سکیں۔سورہ مومن، آیت ۲۵) کوئی انسان بھی لامحدود اور پوری دنیا پر محیط ہمہ گیر قدرت کا مالک نہیں ہوسکتا۔

- ❏ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع کرتا ہے اور ہمہ گیر ودائمی فساد کی روک تھام کے لیے ان کو ایک دوسرے سے ٹکراتا اور ان کا زور توڑتا رہتا ہے

قرآن کہتا ہے کہ شر پسند لوگ، سب نہایت کم زور لوگ ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔وَأَلْقَينَا بَينَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيامَةِ كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ وَيسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا وَاللَّهُ لَا يحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے جب کبھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اُس کو ٹھنڈا کر دیتا ہے یہ زمین میں فساد پھیلانے کی سعی کر رہے ہیں مگر اللہ فساد برپا کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ سورہ مائدہ، آیت ۶۴) ہر سازشی نظریے کی بنیاد اس مفروضے پر ہوتی ہے کہ اللہ کے دشمن انتہائی منظم اور متحد لوگ ہیں۔ قرآن اس مفروضے کی تردید کرتے ہوئے صاف کہتا ہے کہ بَأْسُهُمْ بَينَهُمْ شَدِيدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يعْقِلُونَ (یہ آپس کی مخالفت میں بڑے سخت ہیں تم انھیں اکٹھا سمجھتے ہو مگر ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں اِن کا یہ حال اِس لیے ہے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں۔ سورہ حشر، آیت ۱۴) ساری دنیا کو بے بس کرنے والی سازش کے لیے ضروری ہے کہ یہ فسادی مکمل طور پر متحد ہوں۔

دنیا کے تمام باصلاحیت اور بااثر افراد اور ادارے، اُن کے آلہ کار ہوں، ہر وہ فرد جو کسی نہ کسی درجے میں واقعہ کو متاثر کرسکتا ہو، وہ ان کا وفادار ہو۔ مثلاً کسی بڑی آسمانی آفت کے نام پر سارے انسانوں کو بے وقوف بنانے کے لیے ضروری ہے کہ دنیا کے تمام حکمراں، تمام متعلقہ سائنسداں، شماریاتی ماہرین، متعلقہ سرکاری وغیر سرکاری اداروں کے منتظمین، کمپنیاں اور ان میں خدمت انجام دینے والے ماہرین وغیرہ سب اس سازش میں شریک ہوں۔ ان سب افراد کی تعداد کروڑوں میں پہنچتی ہے۔ ان کا تعلق مختلف قومیتوں، مذاہب اور نظریات سے ہے، وفاداریاں مختلف بلکہ بعض اوقات متصادم ہیں۔ اسی طرح کا معاملہ ویکسین سے متعلق اور ماحولیاتی تبدیلی سے متعلق امور کا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ سب ایک سازشی ٹولے کا آلہ کار بن کر متحد ہوکر ساری انسانیت کے خلاف جرم میں شریک ہوجائیں؟ اور دنیا میں ہمیشہ کے لیے یا ایک لمبی مدت کے لیے ہمہ گیر فساد پیدا کردیں؟

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں فتنہ وفساد پھیلانے والی قوتوں کے ساتھ سارے عالم انسانی کا ایسا متفقہ اشتراک، اللہ کی سنت کے خلاف ہے۔ انسانوں کے مختلف گروہوں کا ایک دوسرے کے ذریعے دفع، یہ اللہ کی مستقل سنت ہے۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ۔ (اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض کے ذریعے سے دفع نہ کرتا رہتا تو (روئے) زمین پر فساد برپا ہوجاتا۔ لیکن اللہ تو جہان والوں پر بڑا فضل رکھنے والا ہے۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۵۱) اس آیت کی تفسیر میں مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

> یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کا انتظام برقرار رکھنے کے لیے یہ ضابطہ بنا رکھا ہے کہ وہ انسانوں کے مختلف گروہوں کو ایک حد خاص تک تو زمین میں غلبہ وطاقت حاصل کرنے دیتا ہے، مگر جب کوئی گروہ حد سے بڑھنے لگتا ہے، تو کسی دوسرے گروہ کے ذریعے سے وہ اس کا زور توڑ دیتا ہے۔[۱۱]

❑ پوری دنیا اور دنیا کے تمام معاملات پر ہمہ گیر استبدادی تسلط و قدرت اور ساری دنیا پر

قدرت مطلقہ، کسی انسان یا انسانی گروہ کو نہیں مل سکتی

قرآن میں کہیں بھی ایسی کسی بڑی اور طاقت ور سازش کا اشارہ موجود نہیں ہے جو سارے انسانوں کو بے بس کر کے رکھ دے۔ قرآن مجید میں سازش کا جہاں بھی ذکر کیا گیا ہے، اسے ایک نہایت کم زور اور بودی چیز بتایا گیا ہے۔ کہا گیا کہ اسلام کے دشمن سازش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ بھی چال چلتا ہے۔ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ (وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔ سورہ انفال، آیت ۳۰) جس طرح لَا اِلٰہ کے ساتھ اِلَّا اللہ کہنا ضروری ہے، اسی طرح يَمْكُرُونَ کے ساتھ يَمْكُرُ اللَّهُ کو ایک اٹل حقیقت کے طور پر پیش نظر رکھنا، ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ یہی مومن اور غیر مومن کے درمیان فرق ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ سازش کرنے والے اپنے جال میں خود ہی پھنستے ہیں۔ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكَابِرَ مُجْرِمِيهَا لِيَمْكُرُوا فِيهَا وَمَا يَمْكُرُونَ إِلَّا بِأَنفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُونَ (اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکر و فریب کا جال پھیلائیں دراصل وہ اپنے فریب کے جال میں آپ پھنستے ہیں، مگر انھیں اس کا شعور نہیں ہے۔ سورہ انعام، آیت ۱۲۳) اور یہ کہ سازش کی عمر ہمیشہ مختصر ہوتی ہے اور دیر سویر وہ ناکام ہو کر رہتی ہے۔ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِن قَبْلُ وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ حَتَّىٰ جَاءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ كَارِهُونَ (اس سے پہلے بھی ان لوگوں نے فتنہ انگیزی کی کوششیں کی ہیں اور تمہیں ناکام کرنے کے لیے یہ ہر طرح کی تدبیروں کا الٹ پھیر کر چکے ہیں یہاں تک کہ ان کی مرضی کے خلاف حق آگیا اور اللہ کا کام ہو کر رہا۔ سورہ توبہ، آیت ۴۸)

طاقت ور سے طاقت ور انسانی گروہ بھی اللہ کے سامنے بالکل بے بس ہے۔ کسی انسان میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ سارے عالم انسانی کو بے بس کر کے رکھ دے۔ ایسا سوچنا انسانوں کو نعوذ باللہ خدائی طاقت میں شریک قرار دینا ہے۔

- وہم و گمان، تجسس، نامعقول سازشی نظریات، بے بنیاد افواہوں پر یقین اور ان کی اشاعت

وغیرہ قابل مذمت ہیں۔

قرآن مجید میں کئی جگہوں پر سازشوں کا ذکر ہے۔ ان کے مطالعہ سے سازشوں کے تمام ڈائنامکس کے تعلق سے قرآن کا نقطہ نظر معلوم ہوتا ہے۔ وہم و گمان، اٹکل اور بے بنیاد اندازے، تجسس، افواہوں کی تخلیق، ان کی اشاعت، ان پر یقین اور ان کی بنیاد پر سوچ اور رویوں کی تشکیل، یہ سب سازشی نظریات کے مسلمہ ڈائنامکس ہیں۔

سورہ نور میں واقعہ افک پر تبصرہ ہے، جو ایک بڑی سازش تھی۔ تبصرہ کرتے ہوئے یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُم مَّا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمٌ (خیال کرو جب تم اپنی زبانوں سے وہ بات نقل کر رہے تھے اور اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جس کی بابت تمھیں کوئی علم نہیں تھا! اور تم اس کو معمولی بات خیال کر رہے تھے حالاں کہ اللہ کے نزدیک یہ ایک بہت بڑی بات ہے۔ سورہ نور، آیت ۱۵) اس آیت میں جو ہدایت کی گئی ہے اور آگے مزید جو ہدایات اور اصول دیے گئے ہیں، ان سے قرآن کا منشا واضح ہوتا ہے کہ مریضانہ تجسس پسندی اور بے بنیاد افواہوں کی اشاعت قرآن کے نزدیک قابل مذمت ہے۔ ایک بندہ مومن کے معاملاتِ زندگی کو، تحقیق پسندی اور دلیل و برہان کی بنیاد پر استوار ہونا چاہیے۔

فرعون کے دربار میں جب جادوگروں نے ایمان لانے کا اعلان کیا تو فرعون اور اس کے حواریوں کا جو بیان قرآن نے نقل کیا ہے اس میں نظریہ سازش کو شکست خوردہ ذہن کی پیداوار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ إِنَّ هَٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوهُ فِي الْمَدِينَةِ لِتُخْرِجُوا مِنْهَا أَهْلَهَا (یقیناً یہ کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اس دار السلطنت میں کی تاکہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کر دو۔ سورہ اعراف، آیت ۱۲۳)

دوسری طرف جو سازشیں واضح دلائل و شواہد کے ساتھ سامنے آئیں، اُن کے سلسلہ میں قرآن بیدار مغزی، مومنانہ فراست اور حوصلہ و جرأت سے ان کے مقابلہ کی تاکید کرتا ہے۔ اس کی

واضح مثال مسجد ضرار کا واقعہ ہے جس کے سلسلہ میں قرآن نے واضح تاکید کی کہ لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا (تم اس میں عبادت کے لیے ہرگز کھڑے نہ ہو۔سورہ توبہ، آیت ۱۰۸)

☐ آسمانی آفات، اللہ کی قدرت وجبروت کی نشانی اور اس کی جانب سے تنبیہ ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہا ہے کہ آسمانی آفتیں، اللہ تعالیٰ انسانوں کو متنبہ کرنے کے لیے بھیجتا رہا ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَخَذْنَاهُم بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ (تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور اُن قوموں کو مصائب و آلام میں مبتلا کیا تاکہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جھک جائیں۔سورہ انعام، آیت ۴۲) انسانی تاریخ کے ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے زلزلوں، طوفانوں، وباؤں وغیرہ کے ذریعے انسانوں کو متنبہ کیا ہے اور اپنی قدرت اور انسانی بے بسی کو واضح کیا ہے۔ مثلاً بنی اسرائیل کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ (آخر کار ہم نے ان پر طوفان بھیجا، ٹڈی دل چھوڑے، سرسریاں پھیلائیں، مینڈک نکالے، اور خون برسایا یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں، مگر وہ سرکشی کیے چلے گئے اور وہ بڑے ہی مجرم لوگ تھے۔ سورہ اعراف، آیت ۱۳۳) ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ہمارے دور میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت منسوخ ہوگئی ہو اور یہ کام اللہ نے، نعوذ باللہ سازشیوں کے حوالے کر رکھا ہو۔

☐ اہل اسلام کے خلاف دشمنوں کی سازشیں خود ہماری کم زوری کی وجہ سے کام یاب ہو جاتی ہیں۔

عام سازشیں لوگ ایک دوسرے کے خلاف کرتے ہیں۔ قرآن بہت واضح طور پر یہ بات کہتا ہے کہ فسادیوں کی یہ حقیر، بودی اور کم زور سازش اگر کہیں کام یاب ہوتی نظر آئے تو وہ محض اہل ایمان کی کم زوری کی وجہ سے ہے۔جب اہل ایمان کم زور (vulnerable) ہو جاتے ہیں تو شیطانی

قوتوں کی سازشوں کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ خود شیطانی سازش کے بارے میں کہا گیا۔ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ (بے شک، جو میرے حقیقی بندے ہیں ان پر تیرا بس نہ چلے گا تیرا بس تو صرف اُن بہکے ہوئے لوگوں ہی پر چلے گا جو تیری پیروی کریں۔ سورہ حجر، آیت ۴۲) قرآن نے کہا کہ صبر اور تقویٰ پیدا کرو، کسی کی کوئی سازش تمہارے مقابلہ میں ٹک نہیں پائے گی۔ إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (تمہارا بھلا ہوتا ہے توان کو برا معلوم ہوتا ہے، اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں مگر ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہوسکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو جو کچھ یہ کررہے ہیں اللہ اُس پر حاوی ہے۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۲۰)

مشکلات و مصائب کا ایک پہلو آزمائش اور امتحان بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ مشکل حالات کے ذریعے اپنے بعض بندوں کو آزماتا ہے۔ لیکن عام طور پر مشکلات کے اسباب اندرونی ہوتے ہیں۔ قرآن نے یہ بات بہت صاف صاف بتائی ہے کہ ہم پر آنے والی ہر مصیبت کے ذمہ دار، خارجی عناصر نہیں بلکہ ہم خود ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنی کم زوریوں، پسپائیوں اور مصیبتوں کے اسباب باہر کی دنیا میں نہیں بلکہ خود اپنے اندر تلاش کرنے چاہئیں۔ وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ (تم پر جو مصیبت بھی آئی ہے، تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے، اور بہت سے قصوروں سے وہ ویسے ہی در گزر کر جاتا ہے۔ سورہ شوریٰ، آیت ۳۰) ہمارے علوم و فنون، ہمارا جاہ و جلال، ہمارا اثر و رسوخ، ہماری طاقت و قوت، ہمارا شاندار ماضی وغیرہ وغیرہ، یہ کسی دشمن کی سازش سے نہیں سلب ہوتا ہے، بلکہ ہماری اپنی کم زوری سے چھن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو اپنا مستقل اصول، یعنی سنت اللہ قرار دیا ہے۔ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ وَأَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (یہ اللہ کی اِس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے

طرزِ عمل کو نہیں بدل دیتی، اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔سورہ انفال، آیت ۵۳)

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر آنے والی بعض بڑی مشکلات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، لیکن کہیں بھی دشمن کی سازش کو ہزیمت کا اصل سبب نہیں قرار دیا۔ مثلاً غزوہ احد میں پیش آنے والی مشکلات پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن نے یہ نہیں کہا کہ یہ اس وجہ سے ہوا کہ قریش کی پلاننگ بہت زبردست تھی، یا کسی نے بڑی سازش رچی تھی یا یہ کہ خالد بن ولیدؓ جیسا ماہر جنگجو اُن کی طرف موجود تھا اور انھوں نے صحیح وقت پر زبردست چال چل کر پانسہ پلٹ دیا۔ یہ سب باتیں ہم کو تاریخ سے معلوم ہوتی ہیں، قرآن نے ان باتوں اور دشمنوں کی چالوں کو اصل سبب نہیں بتایا۔ بلکہ صاف صاف لفظوں میں سبب بس یہ بتایا ہے کہ أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (اور یہ تمھارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے یہ کہاں سے آئی؟ حالاں کہ (جنگ بدر میں) اس سے دو گنی مصیبت تمھارے ہاتھوں (فریق مخالف پر) پڑ چکی ہے اے نبی، اِن سے کہو، یہ مصیبت تمھاری اپنی لائی ہوئی ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔سورہ آل عمران، آیت ۱۶۵) اور پھر تفصیل سے بتایا ہے کہ وہ کم زوریاں کیا تھیں؟

قرآن نے اس کے علاوہ بھی متعدد جگہوں پر ایسے تبصرے کیے ہیں۔ فتح و شکست، عروج و زوال اور نرم گرم حالات پر قرآن نے جہاں بھی تبصرہ کیا ہے، اس سے وہ اہل ایمان کی اس طرح تربیت کرتا ہے کہ زندگی علم و یقین، تحقیق و دلیل اور محکمات و تجربات کی روشن شاہراہ پر آگے بڑھے اور تردد و تذبذب، گمان و بے یقینی، بے عملی اور بے بنیاد اٹکلوں کی تاریک وادیوں میں بھٹک کر نہ رہ جائے۔

غلط سازشی نظریات کی پہچان

اوپر کی بحث سے غلط سازشی نظریات کی شناخت کے کچھ اہم پیمانے معلوم ہوتے ہیں۔ جدید فلسفیانہ طریقوں میں بھی ان پیمانوں کی تائید ملتی ہے۔

۱۔ ہر وہ نظریہ جس میں سازش کرنے والے کو غیر معمولی اور مافوق البشر قوت کا مالک اور عالمی احوال پر مکمل قدرت کا حامل باور کرایا گیا ہو۔

۲۔ ہر وہ نظریہ جس میں کسی عظیم قدرتی آفت کو یا دنیا بھر کو بے بس کر دینے والی کسی مصیبت کو، کسی انسانی گروہ کی خفیہ منصوبہ بندی کا نتیجہ بتایا گیا ہو۔

۳۔ ہر وہ نظریہ جس میں سازش کے توڑ یا اس کے مقابلہ کی کوئی ممکن شکل نظر نہ آتی ہو اور جو کسی ٹھوس جوابی حکمت عملی کی طرف رہ نمائی نہ کرتا ہو۔[۱۲]

اس کے علاوہ درج ذیل بعض اور طریقے ہیں جو تحقیق و تفتیش کے عصری طریقوں سے ماخوذ ہیں:

۴۔ غلط سازشی نظریہ کی ایک بڑی اہم پہچان اس کی اندرونی کم زوریاں ہوتی ہیں، اس میں اندرونی تضادات ہوتے ہیں، اہم سوالوں کے جوابات نہیں ملتے اور نظر آنے والے حقائق سے یا ٹھوس سائنسی صداقتوں سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔[۱۳] مثلاً یہ کہنا کہ ماحولیاتی تبدیلی سازش کی خاطر گھڑا ہوا ایک جھوٹ ہے، بہت سے اُن مشاہدات کے خلاف ہے جو ہر آدمی کر رہا ہے۔ یا یہ نظریہ کہ کینسر سرے سے کوئی بیماری ہی نہیں ہے بلکہ محض فلاں وٹامن کی کمی ہے، اُن لاکھوں اموات کی کوئی توجیہ نہیں کر پاتا جو ہر جگہ ہو رہی ہیں، اس سوچ کے حاملین اور ان کے اقرباء کے حلقوں میں بھی ہو رہی ہیں۔

۵۔ ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ نظریہ پیش کرنے والے یہ نہیں بتا پاتے کہ اس سازش سے کس کو فائدہ ہو سکتا ہے؟[۱۴] اور کیا ہو سکتا ہے؟ مثلاً دنیا بھر میں پھیلنے والی کورونا بیماری کا فائدہ کس کو ہو سکتا ہے؟ ویکسین تیار کرنی والی کمپنیاں؟ یہ کمپنیاں کتنا فائدہ حاصل کریں گی؟ یہ فائدہ اس نقصان کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے جو اس وبا کے نتیجہ میں معیشتوں کو پہنچ رہا ہے؟ اگر یہ چند ویکسین بنانے والی کمپنیوں کی سازش ہے تو دنیا بھر کے ڈاکٹر، حکومتیں، ماہرین حیاتیات، پالیسی ساز، اسپتال وغیرہ سب کیوں ساتھ دے رہے ہیں؟ اگر کوئی گروہ اس کے ذریعے دنیا کا

کنٹرول حاصل کرنا چاہتا ہے تو یہ عمل کیسے ہوگا؟ وبامیں اور اس ان دیکھی غیبی قوت کے کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش میں کیا تعلق ہے؟ اور اگر وہ قوت اتنی طاقت ور اور بااثر ہے کہ دنیا بھر کی حکومتوں ہی کو نہیں بلکہ دنیا کے سارے اداروں، ارباب علم، سائنس دانوں، ڈاکٹروں، مذہبی وسماجی رہ نماؤں وغیرہ کو ایک قبیح غیر انسانی جرم پر مجبور کرسکتی ہے، تو پھر اسے کنٹرول حاصل کرنے کے لیے کسی ڈرامہ کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا استبدادی کنٹرول تو پہلے ہی سے موجود ہے!

٦۔ سازشی نظریہ کی جانچ، سازش کے درجے (scale) کو سامنے رکھ کر بھی کی جاسکتی ہے۔[۱۵] جس امکانی سازش میں جتنے کم افراد کی شمولیت ہو، اس سے جتنے کم لوگ متاثر ہوں، اس کا جتنا کم نقصان ہو، جتنے کم جغرافیائی علاقہ پر اور جتنے کم وقفہ کے لیے اس کا اثر ہو، اُس کے صحیح ہونے کا امکان اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ چند لوگ مل کر، دس بیس افراد کے خلاف، یا کسی ایک حکومت کے خلاف، سال دو سال کے لیے کوئی سازش کریں اور انھیں نقصان پہنچائیں یہ ممکن ہے۔ لیکن دنیا کے کروڑوں لوگوں کے خلاف سازش، دسیوں ممالک کے خلاف سازش، ساری دنیا کو معطل اور بے بس کر کے رکھنے والی سازش، یا ایسی سازش جو کئی دہوں اور صدیوں تک جاری رہے یہ عقلاً ممکن نہیں ہے اور اللہ کی سنت کے خلاف ہے۔

۷۔ غلط سازشی نظریہ کو ان حقائق اور معلومات (data) کی جانچ کے ذریعے بھی پہچانا جاسکتا ہے جنھیں نظریہ کی بنیاد بنایا جاتا ہے یا اس کی تائید میں بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے۔ غلط سازشی نظریات جھوٹ اور غلط خبروں کی بنیاد پر پھیلائے جاتے ہیں۔ حکم رانوں، ماہرین اور دیگر بڑی شخصیات سے غلط بیانات منسوب کرنا یا اُن کے بیانات کو توڑ مروڑ کر ان سے غلط مطلب اخذ کرنا، کتابوں اور جرنلوں وغیرہ کے غلط اور گمراہ کن حوالے، جعلی تصاویر اور ویڈیوز، غلط اور فرضی سائنسی ڈاٹا، سائنسی اصولوں کی گمراہ کن لیکن (بھاری بھرکم اصطلاحات کے استعمال کی وجہ سے) مرعوب کن تعبیرات، ان سب کو عام طور پر نامعقول سازشی نظریات کی بنیاد بنایا جاتا ہے۔ یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ عام لوگ ہی نہیں بلکہ پڑھے لکھے لوگ بھی ایسی باتوں سے مرعوب

ہو جاتے ہیں، حالاں کہ موجودہ دور میں غلط باتوں کی تحقیق بہت آسان ہے اور تھوڑی سی کوشش سے ہم واقعات و معلومات کی صداقت کی جانچ کر سکتے ہیں۔

۸۔ اسی سے متعلق ایک اور جانچ جسے ماہرانہ شہادت (epistemic authority) کی جانچ کہتے ہیں، یہ ہے کہ نظریات پیش کرنے والوں یا نظریات کی بنیاد بننے والے ڈاٹا کی پیش کش کرنے والوں کے علم اور تخصص کی جانچ کی جائے۔ آج کی پیچیدہ دنیا میں ہر معاملہ کو گہرائی سے سمجھنے کے لیے مخصوص علوم و فنون میں اعلیٰ درجے کا درک درکار ہوتا ہے۔ جس شعبہ سے متعلق معاملہ ہو، اس کے معتبر اہل علم و اہل فن کو پہچاننے کی صلاحیت اور ان پر اعتماد، یہ سنجیدہ علمی تجزیوں کی نہایت اہم ضرورت ہے۔ بہت سے لوگ یہ بھی نہیں سمجھ پاتے کہ زیر بحث معاملہ کا تعلق کس شعبہ علم سے ہے۔ مثلاً وائرس کے پھیلاؤ کے علم کا تعلق ڈاکٹروں سے نہیں بلکہ وائرولوجی اور ایپیڈیمیولوجی سے ہے

اوپر جن واقعات کو ہم نے معقول سازشی نظریات کی مثالوں کے طور پر درج کیا ہے، ان کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ ان کی سرکاری توجیہات کو رد کرنے والے یا ان پر شبہات کا اظہار کرنے والے عام لوگ نہیں ہیں بلکہ اپنے شعبہ کے معتبر ترین اہل علم ہیں۔ عراق جنگ پر اول روز سے دنیا بھر کے کئی معروف ماہرین سیاسیات و عسکریات امریکی و برطانوی حکومتوں کی باتوں کو رد کرتے رہے ہیں۔ دہشت گردی کے واقعات پر تحفظ کا اظہار کرنے والے، انتہائی سینیر پولیس افسران، قومی سلامتی کے ماہرین، جج صاحبان اور دیگر ماہرین ہیں۔ ہر معقول بات کے سلسلے میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کچھ بندوں کو دنیا کے سامنے سچائی لانے کے لیے آگے بڑھاتا ہے۔ کوئی سازشی نظریہ حقیقت سے قریب ہو تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ دنیا کے تمام معتبر اہل علم و فن اس پر خاموش رہیں اور اس کو بے نقاب کرنے کا کام، غیر معروف، نیم خواندہ یا متعلقہ شعبہ فن سے غیر متعلق نظریہ سازوں کے حوالے ہو جائے۔ اس لیے تشخیص کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ پیش کرنے والوں کی قابلیت و استناد کی جانچ کی جائے اور معتبر ماہرین فن سے ان کی رائے معلوم کی

جائے۔ یہ کام بھی سنجیدگی اور باریک بینی چاہتا ہے۔ اس لیے کہ اکثر سازشی نظریات کو پیش کرنے والے خود کو ماہرین فن کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ کم علم عطائی بھاری بھرکم اصطلاحات کے ساتھ خود کو ماہر ڈاکٹر بناکر پیش کرتے ہیں، وغیرہ۔ آج کے زمانہ میں کسی بھی شخص کے پروفائل کی جانچ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ایک منٹ میں یہ جانچ ہوسکتی ہے۔ اس کی عادت ہم کو ڈالنی چاہیے۔ خود ہمارے حلقوں میں، اور دنیا بھر کے اسلامی و تحریکی حلقوں میں اب الحمدللہ، ہر میدان کے ماہرین موجود ہیں۔ ان کی آرا پر اعتماد کرنا چاہیے۔

۹۔ اس کے علاوہ سازشی نظریات کی تنقیح کے بعض اعلیٰ سائنسی طریقے (مثلاً قابلیتِ تکذیب کا ٹسٹ (falsifiability test) وغیرہ) بھی ہیں۔ محققین نے ایسے ریاضیاتی ماڈل بھی تشکیل دیے ہیں[۱۶] جن کو استعمال کرکے بہت سے نظریات کی تنقیح کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ پیچیدہ علمی بحث، اس مقالہ کے دائرہ سے باہر ہے۔ ہم کسی اور مناسب پلیٹ فارم پر اس کو زیر بحث لائیں گے۔ دل چسپی رکھنے والے اہل علم فی الحال حاشیے میں درج کتابوں اور مقالات سے مدد لے سکتے ہیں۔[۱۷]

یہ واقعاتی حقیقت ہے کہ ہر بڑے واقعہ یا حادثہ سے فائدہ اٹھانے کی لوگ کوشش کرتے ہیں۔ موجودہ دور کی مادہ پرست کفن چور ذہنیت نے اس رجحان کو اور فروغ دیا ہے۔ حادثات اور قدرتی آفات یا کسی انسانی غلطی سے پیدا ہونے والی تباہ کن صورت حال کا بدطینت لوگ، ادارے اور حکومتیں، اپنے سیاسی، معاشی اور دیگر مفادات کے لیے استعمال کرسکتے ہیں اور کرتے رہے ہیں۔ کسی زلزلہ، سونامی، عالمی وبا وغیرہ کی صورت حال کا مفادات حاصلہ کے لیے استحصال کرنا، اس غرض کے لیے دھوکے اور مبالغہ سے کام لینا، یا غلط معلومات بہم پہنچانا وغیرہ ایک مختلف بات ہے اور آفت کو بطور سازش تخلیق کرنا الگ ہے۔ پہلی بات کا امکان بہت زیادہ رہتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے جو شکوک پیدا ہوتے ہیں وہ دوسری بات تک پہنچاتے ہیں۔[۱۸] اس لیے اس بات کی سنجیدہ کوشش ہونی چاہیے کہ اگر کہیں کوئی سازش نظر آئے تو اس کی حقیقت کو سمجھا جائے اور جتنی وہ ہے اتنی ہی دیکھی اور دکھائی جائے۔

سازشی نظریات اور کتاب الفتن کی روایات

سازشی نظریات کے لیے فتنہ دجال اور اُن روایتوں کا سہارا لیا جاتا ہے جو حدیث کی کتابوں میں باب الفتن کے تحت درج ہیں۔ چنانچہ باور کرایا جاتا ہے کہ جو کچھ خراب ہو رہا ہے وہ دجال اور اس کے حواری کرا رہے ہیں — اس طرح سوچنے والوں کے پاس کبھی کوئی سولیوشن یا حل نہیں ہوتا۔ دجال کے فتنے کا مقابلہ تو سیدنا مہدی اور سیدنا عیسیٰ علیہما السلام کریں گے۔ اس لیے ہمارا کام بس یہ رہ جاتا ہے کہ ان کا انتظار کریں اور اس وقت تک ہر چھوٹی بڑی مصیبت کو دجالی سازش سے جوڑ کر کڑھتے اور گھلتے رہیں۔

کتاب الفتن کی روایتوں کے بارے میں یہ بات ہم کو سمجھنی چاہیے کہ قیامت کی جو نشانیاں اللہ کے رسول ﷺ نے بتائی ہیں وہ بہت واضح ہیں۔ ان سب نشانیوں کو ایک ساتھ سامنے رکھ کر ہی ان سے کوئی نتیجہ نکالنا درست ہے۔ ایک آدھ روایت کو اِدھر اُدھر سے پکڑ کر یہ کہنا کہ اب دجال کا زمانہ آگیا ہے اور قیامت آلگی ہے، نہایت گمراہی کی بات ہے۔ ہماری تاریخ میں ہر مشکل دور میں قربِ قیامت کی اس طرح کی باتیں ہوتی رہی ہیں۔

اس وقت جو کش مکش ہو رہی ہے وہ حق و باطل کی کش مکش ہے جو تاریخ کے ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ یہ چراغ مصطفوی اور شرار بولہبی کی مستقل کش مکش ہے جس میں ہمیں اپنا رول ادا کرنا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے مہدی کا یا عیسیٰ کا انتظار نہیں کرنا ہے۔ جب مہدی آئیں گے یا عیسیٰ آئیں گے وہ اپنا کام کریں گے۔ اس وقت تو ہمیں اپنی ذمہ داری ادا کرنی ہے۔ ہر شرار بولہبی کو ہم دجال سمجھ بیٹھیں گے تو اپنا رول ادا نہیں کر پائیں گے۔ اس کش مکش میں ہمارے اپنے زمانہ میں چراغ مصطفوی کی نمائندگی کا فریضہ ہم پر ہے اور ہم اس کے لیے جواب دہ ہیں۔ اگر ہم صحیح رخ پر اور صحیح جذبہ کے ساتھ جدوجہد کریں گے تو اللہ کی مدد و نصرت ہمارے شامل حال رہے گی اور عام قوانین فطرت کے مطابق ہماری کام یابی و ناکامی کا فیصلہ ہوگا۔ جو صلاحیت و قوت اللہ تعالیٰ نے ہمارے دشمنوں کو دی ہے وہی ہم کو بھی دی ہے۔ ان سے مرعوب ہو کر حوصلے ہارنے کی کوئی وجہ

نہیں۔ اللہ تعالیٰ اچھے اور برے دنوں کو لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتا ہے۔ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۴۰) آزمائشوں اور مشکل حالات کی عمر مختصر ہوتی ہے، ان سے گھبرا کر فسادیوں کو لامحدود قوت کا مالک سمجھ بیٹھنا بہت بڑی غلطی اور بڑی نفسیاتی کم زوری ہے۔

ہمارا مطلوب عملی رویہ

بے شک ہم کو دنیا کے احوال اور شر پسند طاقتوں کی سازشوں سے باخبر رہنا چاہیے۔ صحیح جدوجہد کے لیے اس کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن اس میں حد سے زیادہ مبالغہ اور ان کو اپنے دماغ پر اس طرح حاوی کر لینا کہ ہر چیز کو اسی عینک سے ہم دیکھنے لگیں، دنیا کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ میں سازش کا پہلو تلاش کرنے لگیں اور ہم کیا کریں اور ہم کو کیا کرنا چاہیے؟ یہ کبھی زیر بحث نہ آئے بلکہ ساری بحث صرف اُن صحیح اور غلط نظریات پر ہو کہ ہمارے سلسلہ میں وہ کیا کر رہے ہیں؟ تو یہ نفسیاتی مرض کی علامت ہے۔ اوپر ہم نے معقول اور نامعقول نظریات کی پہچان بتائی ہے۔ جو معقول نظریات ہیں، ان پر بے شک ہم کام کریں اور ان سازشوں کے مناسب توڑ کی سعی کریں لیکن نامعقول نظریات سے اپنا پیچھا چھڑائیں اور ان سے امت کو بھی محفوظ رکھیں۔

امت مسلمہ کی تو یہ ذمہ داری ہے کہ وہ نہ صرف اپنے مسائل کا خود چارج لے بلکہ دنیا کے مسائل کا بھی آگے بڑھ کر چارج لے۔ جس دن ہم اپنے اور دنیا کے مسائل کے لیے خود کو ذمہ دار سمجھیں گے اور ان کے حل کا پورا چارج خود لیں گے، وہ ترقی اور کام یابی کی شاہراہ پر ہمارا پہلا قدم ہوگا۔ اپنی کسی ناکامی کے لیے دوسروں کو ذمہ دار قرار دینے کا رویہ دراصل راہ فرار ہے۔ جو فرد یا قوم اس راہ فرار کی عادی ہو جاتی ہے وہ کبھی کام یابی کا سرا نہیں پا سکتی۔ ایک کام یاب فرد، اپنی ناکامی کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ اس کے اسباب، بیرون سے زیادہ اپنے اندرون میں تلاش کرتا ہے۔ بیرونی احوال اس کے کنٹرول میں نہیں ہوتے۔ اس لیے انھیں وہ خدا کے سپرد کر دیتا ہے البتہ اندرونی احوال پر اس کا

کنٹرول ہوتا ہے۔ وہ ان کی اصلاح کرتا ہے۔ زیادہ قوت اور زیادہ دانش مندی کے ساتھ کوشش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ کام یاب ہوجاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی کام یابی کے لیے توکل کو ضروری قرار دیا ہے۔ تَوَکُّل کا فلسفہ ہم کو آخری حد تک ہمت ہارے بغیر اور مایوس ہوئے بغیر کوشش کرتے رہنے پر آمادہ کرتا ہے۔ تَوَکُّل ہم کو باعمل اور عملیت پسند (pragmatic) بناتا ہے۔ یہ ہمیں ممکنات پر ارتکاز عطا کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ جو امور ہم پر واضح نہیں ہیں، یا ہمارے دائرہ اختیار سے پرے ہیں وہ خدا کے حوالہ کرنا اور جو کام اور جو امور ہمارے لیے ممکن ہیں، جن کے ہم مکلف ہیں، ان پر اپنی ذہنی و عملی توانائیوں کو مرکوز کرنا ہی توکل ہے۔ کم زور اور ناکام افراد اور قوموں کی ایک کم زوری یہ ہوتی ہے کہ ان کی زیادہ توجہ بیرونی مسائل، مشکلات اور دوسروں کی چالوں اور سازشوں پر ہوتی ہے۔ جب کہ کام یاب افراد کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان کی نظر اپنے مقصود پر ٹکی ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کی چالوں اور حرکتوں سے بس اسی حد تک تعارض رکھتے ہیں جس حد تک خود ان کی جدوجہد کے رخ اور حکمت عملی کے تعین کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ جو کچھ ان کے بس میں ہے اور ممکن ہے، اسے کر گزرنے پر ان کی زیادہ توجہ ہوتی ہے۔ جو امور ان کے دائرہ امکان سے پرے ہیں، ان پر وہ زیادہ دھیان نہیں دیتے۔ تَوَکُّل یہی اسپرٹ پیدا کرتا ہے۔ امکان کی آخری حد تک کوشش کرنا اور جو امور ہمارے دائرہ اختیار سے باہر ہوں، ان کو خدا کے حوالہ کر دینا یہی تَوَکُّل ہے۔ یہ سوچ کا ایک بالکل مختلف پیراڈائم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو بھی یہی حکم دیا ہے کہ دشمنوں کی حرکتوں میں زیادہ نہ الجھیں، بس اپنا کام کرتے رہیں۔ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ (اور ہم نے تو اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے رہے ہیں۔ اگر تمہارے رب کی مشیت یہ ہوتی کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کرتے۔ پس تم انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ اپنی افترا پردازیاں

کرتے رہیں۔سورہ انعام، آیت ۱۱۲)

سید قطب شہیدؒ نے اس آیت پر جو تفصیلی تفسیری نوٹ تحریر فرمایا ہے وہ بصیرت افروز ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے ہم اس نوٹ کا صرف ایک پیراگراف یہاں نقل کر رہے ہیں۔

> ان قوتوں کی یہ مکاری مکمل طور پر آزاد اور بے قید بھی نہیں ہے۔ اس کے اردگرد مشیت الٰہی کا ایک وسیع دائرہ ہے۔ یہ شیاطین جو سرگرمیاں بھی دکھاتے ہیں وہ اللہ کی مشیت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ یہ مشیت کا دائرہ اللہ کی تقسیم کا دائرہ ہے۔ یہیں سے اللہ کے بندوں کی نظروں میں شر کی قوتوں کا یہ جماوڑا اور ان کی پشت پر عالمی تائید پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ یہ مقید اور پابہ زنجیر ہے۔ یہ جماوڑا اور گٹھ جوڑ بے قید اور آزاد نہیں ہے۔ اللہ جس طرح چاہتا ہے، کرتا ہے اور یوں نہیں کرتا کہ ہر کوئی ان کے اس جال میں بغیر کسی مدافعت اور مزاحمت کے پھنس جائے جس طرح ہمیشہ تمام سرکش شیاطین چاہتے ہیں کہ انھیں بے قید حاکمیت حاصل ہو اور لوگ ان کی غیر مشروط اطاعت کریں اور ان کی مرضی اور خواہش کے اوپر عمل پیرا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ان سرکشوں کی تمام سرگرمیاں اللہ کی مشیت اور اس کی تقدیر اور ضوابط کے اندر محدود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شیطانی قوتیں اللہ کے دوستوں کو کوئی اذیت اور نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ ہاں اس قدر اذیت یہ ضرور پہنچا دیتے ہیں جس قدر اللہ اپنے دوستوں کی آزمائش کے طور پر اجازت دے۔ آخر کار تمام معاملات اللہ کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ اس لیے اہل حق کو چاہیے کہ وہ اپنے یقین اور عقیدے کو اللہ کی ذات کبریا کے ساتھ وابستہ رکھیں خواہ شیطان چاہے یا نہ چاہے۔ اور وہ اپنی راہ پر اس طرح گامزن رہیں کہ ان کے اخلاق و اعمال میں سچائی رچی بسی ہو، ان کے دل و دماغ حق سے سرشار ہوں۔ رہی شیطانوں کی دشمنی اور ان کی مکاری تو اہل حق کو چاہیے کہ ان کو اللہ کی مشیت اور قدرت کے حوالے کر دیں جو ہر صورت میں کام یاب اور غالب رہتی ہے۔ اس لیے کہ یہ سب امور اللہ کی مشیت کے مطابق چلتے ہیں اور ''اگر تمہارے رب کی مشیت ہوتی تو وہ ایسا نہ کرتے پس انھیں چھوڑ دیں جو چاہیں افترا پردازیاں کرتے پھریں۔[۱۹]

(زندگی نو، جون ۲۰۲۰)

حواشی و حوالہ جات

۱۔ Mintz, Frank P. (1985). The Liberty Lobby and the American

Right: Race, Conspiracy, and Culture. Westport, CT: Greenwood.

۲۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے:
Michael Barkun (2013), A Culture of Conspiracy :Apocalyptic Visions of Contemporary America, University of California Press, Berkeley.

۳۔ https://www.cl.cam.ac.uk/~mgk25/volatile/Niemitz-1997.pdf

retrieved on May 31, 2020

۴۔ اصل نظریہ کی حمایت میں لکھی گئی دل چسپ کتاب دیکھیے:
Bat Ye'or (2005) Eurabia: The Euro-Arab Axis, Fairleigh Dickinson University Press

اور اس کے تنقیدی جائزے کے لیے دیکھیے:
Andrew Brown (16 August 2019) "The myth of Eurabia: how a far-right conspiracy theory went mainstream". The Guardian. Retrieved on May 31, 2020.

۵۔ 5. Terry L. Cook (2009) The Antichrist's New World Order: What

Will Happen to America?, CreateSpace.

۶۔ عراق جنگ کی تحقیقات کے لیے برطانوی حکومت کی جانب سے بنائے گئے، سرجان چلکوٹ کمیشن کی رپورٹ، جس نے اس جنگ کو غیر قانونی قرار دیا تھا

۷۔ کارل پوپر نے اس صورت حال پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ دیکھیے:
Karl R. Popper, The Conspiracy Theory of Society, as quoted in Cass Sunstein and Adrian Vermeule, Conspiracy Theories in University of Chicago Law School, Law and Economic Research Paper Series, Paper no. 38, 2008.

۸۔ سازشی نظریات کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے دیکھیے ایک دل چسپ کتاب:
Bilewicz, Cichocka and Soral (Eds.) (2015), The psychology of conspiracy, Routledge, New York,

۹۔ سازشی نظریات اور شکست خوردگی میں تعلق کے لیے دیکھیے:
Joseph Uscinski and J.M. Parent, (2014) American Conspiracy Theories, Oxford University Press, New York. Chapter 6 (Pages 130-153)

۱۰۔ Peter Knight (Ed.) (2003), Conspiracy Theories in American History: An Encyclopedia, ABC CLIO: Santa Barbara USA.

۱۱۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تفہیم القرآن، جلد اول، حاشیہ ۲۷۴

۱۲۔ Hepfer, K. (2015). Verschwörungstheorien: Eine philosophische Kritik der Unvernunft. Transcript Verlag. As quoted in Internet Encyclopedia of Philosophy, https://www.iep.utm.edu/conspira/ retrieved on June 1, 2020

۱۳۔ Basham, L. (2001). "Living with the Conspiracy", The Philosophical Forum, vol. 32, no. 3, p.265-280.
As quoted in Internet Encyclopedia of Philosophy, https://www.iep.utm.edu/conspira/ retrieved on June 1, 2020

۱۴۔ Hepfer, K. (2015). Verschwörungstheorien: Eine philosophische Kritik der Unvernunft. Transcript Verlag. As quoted in Internet Encyclopedia of Philosophy, https://www.iep.utm.edu/conspira/ retrieved on June 1, 2020

۱۵۔ Ibid.

۱۶۔ مثلاً ایک دل چسپ ریاضیاتی ماڈل دیکھیے:
Grimes DR (2016) On the Viability of Conspiratorial Beliefs. PLOS ONE 11 (1) : e0147905. https://doi.org/10.1371/journal.pone.0147905

۱۷۔ اس موضوع پر مختصر مطالعہ کے لیے درج ذیل کتاب کے باب سے مدد لی جاسکتی ہے۔ اس میں مصنف نے ایسے نظریات کی تنقیح کے چھ اہم سائنسی طریقے تجویز کیے ہیں۔ مصنف کے بعض خیالات سے اختلاف کے باوجود اس کے تجویز کردہ طریقے ہمارے لیے مفید ہیں۔
Joseph Uscinski and J.M. Parent, (2014) American Conspiracy Theories, Oxford University Press, New York. Chapter 2 (Pages 23-53)

مزید گہرے مطالعہ کے لیے درج ذیل کتابوں سے مدد لی جاسکتی ہے۔
David Coady (Ed.) (2006) Conspiracy Theories: Philosophical Debates, Ashgate Publishing Co. London

۱۸۔ اس موضوع پر نوم چومسکی کا ایک مختصر انٹرویو بہت واضح اور متوازن نقطہ نظر پیش کرتا ہے
https://zcomm.org/zblogs/9-11-institutional-analysis-vs-conspiracy-theory-by-noam-chomsky/ retrieved on June 2, 2020

۱۹۔ سید قطب شہید، فی ظلال القرآن، الانعام ۱۱۲ کے حواشی

آخر زمان، دجال اور سازشیت

سازشی نظریات کے لیے عام طور پر فتنہ دجال، یاجوج وماجوج اور قربِ قیامت اور آخر زمان (End Time) سے متعلق روایتوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ان روایات کا ایک حصہ تو ضعیف و موضوع اور اسرائیلی روایات پر مشتمل ہے، لیکن ایک بڑا حصہ صحیح احادیث میں بھی ملتا ہے۔ صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ اور جامع ترمذی میں کتاب الفتن کے عنوان سے، صحیح مسلم میں کتاب الفتن و اشراط الساعۃ کے عنوان سے اور سنن ابو داود میں کتاب الفتن و الملاحم، کتاب المہدی اور کتاب الملاحم، ان تین عنوانات کے تحت محدثین کرام نے قیامت کی علامتوں، آخر زمان کے فتنوں اور دیگر نبوی پیشین گوئیوں سے متعلق احادیث جمع کی ہیں۔ آج کے اشارات میں حسبِ وعدہ ہم ان روایات کے تجزیے کی کوشش کریں گے اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ ان روایات سے کیا معلوم ہوتا ہے اور ان کا اصل سبق کیا ہے؟

آخر زمان سے متعلق روایات اور نظریاتِ سازش

رسول اللہ ﷺ نے قیامت کی اور قرب قیامت کی متعدد نشانیاں بتائی ہیں۔ قیامت کے قریب ایک نہایت پر فتن دور کی پیشین گوئی فرمائی ہے جس میں بے انتہا خون خرابہ ہوگا، طرح طرح کے فتنوں کا ظہور ہوگا اور ایمان کو بچانا مشکل ہو جائے گا۔ مسیحِ دجّال (جسے دجال اکبر یا کانا دجّال بھی کہا جاتا ہے) کے فتنے کی خبر دی گئی ہے جو بہت ہی ظالم اور غیر معمولی بلکہ مافوق الفطری قوتوں کا مالک ہوگا اور خدائی و نبوت کا دعوے دار ہوگا۔ مہدی کی آمد کے بارے میں بتایا گیا جو مسلمانوں کے ایک نہایت صالح اور باصلاحیت امام ہوں گے اور دنیا میں بے نظیر عدل و انصاف قائم کریں گے۔ اسی

طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی خبر دی گئی جو دجّال سے دنیا کو نجات دلائیں گے۔ یاجوج ماجوج کی یلغار پر مطلع کیا گیا جو دنیا بھر میں بدامنی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کریں گے اور آخر کار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بد دعا سے ہلاک ہو جائیں گے۔

ان تمام روایتوں کے حقیقی (exact) مفہوم تک قطعیت کے ساتھ پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ امین و صادق رسول ﷺ نے بعض جگہوں پر استعارے کی زبان استعمال کی ہو۔ مثلاً دجال کی انتہائی تیز رفتار سواری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ایک گدھا ہو گا[1] جس پر دجّال سوار ہو گا اور یہ گدھا انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ اُسے دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک، پہنچاتا رہے گا۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ واقعی گدھا ہو گا یا کوئی ترقی یافتہ عصری سواری ہو گی جسے آپ ﷺ نے اپنے مخاطبین کو سمجھانے کے لیے گدھے سے تعبیر کیا ہو۔ اس حد تک معنوں کی مختلف تعبیرات کی اِن روایات میں گنجائش ہے اور ہمارے علما کی تشریحات میں بھی ایسی مختلف رائیں ملتی ہیں، لیکن سازشیت کے علم بردار ان روایات کی دور از کار تاویلات کرتے ہیں۔ کھینچ تان کر انھیں عصر حاضر کی ترقیوں پر، اور موجودہ دور کے سیاسی و تمدنی واقعات و حادثات پر منطبق کرتے ہیں۔ ان کی بنیاد پر اس زمانہ کو آخر زمان یعنی وہ دور فتن قرار دے دیتے ہیں جو قیامت سے بالکل لگا ہوا ہے۔ چوں کہ دجّال کا کوئی وجود نظر نہیں آتا اس لیے طرح طرح کی تاویلات سے کسی تمدّنی نظام کو، کسی حکومت کو، کسی ٹکنالوجی کو، ٹکنالوجی کے کسی نظام کو اور اس طرح کی دیگر اجتماعی ہئیتوں یا غیر مرئی چیزوں کو دجال اکبر قرار دے دیتے ہیں۔ چنانچہ کسی کے نزدیک ٹی وی دجال ہے تو کسی کے نزدیک کارپوریٹ کمپنیاں، کسی کے نزدیک جدید مغرب کا سیاسی و عسکری مقتدرہ دجال اکبر ہے تو کسی کے نزدیک پورا میڈیا۔ اسی طرح ان روایتوں کو جن میں خون خرابے اور جنگ و جدال کا ذکر ہے، عصری واقعات پر منطبق کیا جاتا ہے اور ان کی بنیاد پر پیشین گوئیاں کی جاتی ہیں کہ فلاں سن میں حضرت عیسیٰؑ کا ظہور ہو گا اور فلاں میں مہدی کا، فلاں میں دجال آئے گا اور اس تاریخ کو قیامت بپا ہو گی۔ ناواقف قارئین کو یہ باتیں مبالغہ آمیز لگیں گی لیکن اردو سمیت، مسلمانوں کی ہر زبان میں ایسے کیلنڈروں پر مشتمل

لٹریچر موجود ہے، جس میں تمام نشانیوں کے ظہور اور وقوع قیامت کی تاریخوں کا تعین کیا گیا ہے۔ (دل چسپ بات یہ ہے کہ ایسی متعدد تاریخیں گزر چکی ہیں!)

اس طرز فکر کے درج ذیل نتائج نکلتے ہیں۔ اور پڑھے لکھے مسلمانوں کے ایک طبقہ میں ان اثرات کو صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ سارے اثرات ہماری اجتماعی زندگی کے لیے کئی پہلوؤں سے نہایت نقصان دہ ہیں۔ اس لیے ان کا نوٹس لینا ضروری ہے:

ا۔ مسیح دجال کو احادیث میں طرح طرح کی مافوق الفطری قوتوں بلکہ خرقِ عادت امور کا مالک قرار دیا گیا ہے۔ اس کی سواری اُسے آناً فاناً دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچادے گی، وہ مردوں کو زندہ کردے گا، جب چاہے گا بارش برسائے گا، جب بولے گا تو ساری دنیا سن لے گی، زراعت اور غذائی پیداوار پر اس کو کنٹرول ہوگا، وغیرہ۔ ان باتوں کو کھینچ تان کر جدید ٹکنالوجی کی صلاحیتوں کو ان خوارقِ عادت کا مظہر قرار دیا جاتا ہے گویا ان سائنسی ترقیوں کا مقصد دجال کے لیے محیر العقول آلات کار فراہم کرنا ہے۔ چنانچہ ہر نئی ٹکنالوجی کے بارے میں یہ گمان پیدا کیا جاتا ہے کہ یہ دجال کا ممکنہ فتنہ ہے۔ (جب ملک میں پہلی بار ٹرین چلی تھی تو بعض مصنفین نے اسے دجال کا گدھا قرار دیا تھا!) یہ طرز فکر ٹکنالوجی کے سلسلہ میں شک، بے زاری اور کراہیت کا رویہ پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ یقین پیدا ہوجائے کہ انٹرنیٹ، کمیونکیشن ٹکنالوجی، فور جی اور فائیو جی، تیز رفتار جہاز، راکٹ، ایگری کلچرل ٹکنالوجی، ویکسین اور بایو ٹکنالوجی وغیرہ سب دجالی فتنے کے آلات کار ہیں تو کوئی صاحب ایمان کیوں اس فتنہ میں خود کو مبتلا کرے گا؟ (ٹکنالوجی کے نقصان دہ پہلو، ماحولیاتی اثرات، اس کی اخلاقیات، اس کا اسلامی نقطہ نظر وغیرہ ایک الگ موضوع ہے۔ ٹکنالوجی کا جدید مغربی تصور بلاشبہ کئی پہلوؤں سے اسلامی نقطہ نظر سے نامناسب ہے۔ اس تصور کو ہم پہلے بھی زیر بحث لاچکے ہیں اور آئندہ بھی لاتے رہیں گے۔ یہاں زیر بحث، ٹکنالوجی کو دجالی فتنہ سمجھ کر بالکلیہ مسترد کرنے کا طرز عمل ہے)۔ چنانچہ یہ سوچ سائنس، ٹکنالوجی اور ٹکنالوجی کی ترقیوں سے دور کرنے کا سبب بنتی ہے۔ اس وقت ٹکنالوجی کے اثرات اتنے ہمہ گیر

ہیں کہ اسلامی نشأۃ ثانیہ کی کوئی اسکیم اس پر مناسب توجہ کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ یہ اہل اسلام کی ذمہ داری ہے کہ وہ ٹکنالوجی سے متعلق چیلنجوں کا حوصلہ وہمت، ذہانت و اختراع اور اقدامی کاوشوں کے ساتھ سامنا کریں لیکن زیر بحث طرز فکر ٹکنالوجی کے سلسلے میں شک و تردد اور فرار و گریز کے رویہ کی افزائش کرتا ہے۔

۲۔ بعض روایات میں یہ اشارے بھی ملتے ہیں کہ فتنوں کے دور میں تمدنی زندگی سے دوری اور پہاڑوں اور غاروں میں پناہ، زیادہ محفوظ راستہ ہوگا۔ اگر یہ یقین پیدا ہوجائے کہ فتنوں کی شدت کا آخری زمانہ آلگا ہے، دجال عنقریب نمودار ہونے والا ہے اور قیامت قریب آچکی ہے، تو جدوجہد اور کوشش و محنت کا داعیہ باقی نہیں رہتا۔ نہ صرف ٹکنالوجی اور سائنسی ترقیوں سے، بلکہ عام تمدنی زندگی سے بھی بیزاری اور وحشت پیدا ہوجاتی ہے۔ چنانچہ ان نظریات کے علم برداروں میں اس طرح کی باتوں کی پرزور وکالت بھی ملتی ہے۔ یہ مزاج تمدنی ترقیوں میں رکاوٹ بنتا ہے اور دنیا کی تمدنی ترقیوں میں اسلام اور اہل اسلام کے فعال اور ایجابی کردار کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ اسلام کی بنیادی روح کے خلاف ہے۔ اسلام مادہ پرستی کی بھی ضد ہے اور رہبانیت کی بھی۔ وہ اپنے ماننے والوں کو، دنیا اور دنیا کے معاملات میں قائدانہ اور ہادیانہ کردار کے لیے تیار کرتا ہے، ترکِ دنیا اور معاملاتِ دنیا سے فرار کے لیے نہیں۔

۳۔ آخری زمانے میں فتنہ و فساد کا خاتمہ اور اسلام کا غلبہ ایک موعود شخصیت یعنی مہدی یا عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں سے ہونے کی پیشین گوئی ہے۔ اگر وقت سے پہلے آخر زمان کا یقین پیدا ہوجائے تو ایک عام آدمی کے لیے حق و باطل کی کش مکش میں بھرپور رول ادا کرنے اور عام قوانین فطرت کے مطابق کام یابی حاصل کرنے کا داعیہ باقی نہیں رہتا۔ وہ مستقبل کو صرف پیشین گوئیوں اور خدا کے تکوینی قوانین کی روشنی میں دیکھتا ہے اور اس میں اپنے کسی رول کی معنویت کو سمجھ نہیں پاتا۔ آخرِ زمان کا احساس خود بخود عیسیٰ مسیح اور مہدی کے خاموش انتظار کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ منصوبہ بندی، حکمت عملی اور جدوجہد کی تاثیر پر یقین باقی نہیں رہتا اور کش مکش و جدوجہد،

جہاد و اجتہاد اور عملی و ذہنی کاوشوں کے محرکات نہایت کم زور ہو جاتے ہیں۔

اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت اور قربِ قیامت کی علامتوں سے متعلق درست اور متوازن فکر کو اختیار کرنا ہماری نظریاتی ہی نہیں عملی ضرورت بھی ہے۔ اس سے متعلق سوچ کا عدم توازن، عملی رویوں میں بھی عدم توازن کا باعث بنتا ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ قرآن مجید، احادیث صحیحہ، معتبر علما کی جانب سے کی گئی ان کی تعبیرات و تشریحات وغیرہ کی روشنی میں، ان باتوں کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے۔ ہم اس سلسلے میں اپنے مطالعہ اور غور و فکر کا حاصل چند نکات کی صورت میں ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔ اہل علم کے سنجیدہ تبصروں کا استقبال ہے۔

قیامت کا قطعی علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے

قرآن مجید میں یہ بات کئی جگہ کہی گئی ہے کہ قیامت کب آئے گی، یہ بات صرف اللہ کو معلوم ہے۔ يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً (یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر وہ قیامت کی گھڑی کب نازل ہوگی؟ کہو "اس کا علم میرے رب ہی کے پاس ہے اُسے اپنے وقت پر وہی ظاہر کرے گا۔ آسمانوں اور زمین میں وہ بڑا سخت وقت ہوگا وہ تم پر اچانک آجائے گا"۔ سورہ اعراف، آیت ۱۸۷)

علامہ ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> قتادہ نے کہا کہ اس کے واقع ہونے کے صحیح وقت کا علم ساری مخلوق پر بھاری ہے۔ زمین و آسمان والے سب اس سے عاجز اور بے خبر ہیں۔ سدی نے کہا کہ کوئی بزرگ سے بزرگ فرشتہ، کوئی بڑے سے بڑا پیغمبر بھی اس کے آنے کے وقت کا عالم نہیں۔ وہ تو سب کی بے خبری میں ہی آجائے گی۔[۲]

سورہ لقمٰن میں اُن باتوں کی فہرست بیان کی گئی ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔ اس میں ایک اہم بات قیامت کا وقت بھی ہے۔ إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ (اُس گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے۔ سورہ لقمٰن، آیت ۳۴)۔ متعدد احادیث میں یہ بات ملتی ہے کہ جب نبی

کریم ﷺ سے وقوعِ قیامت کا وقت پوچھا گیا تو آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

سورہ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا ارادہ و منشا بھی بیان کر دیا ہے کہ میں قیامت کے علم کو مخفی رکھنا چاہتا ہوں۔ إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ۔ (قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے میں اُس کا وقت مخفی رکھنا چاہتا ہوں، تاکہ ہر متنفّس اپنی سعی کے مطابق بدلہ پائے۔ سورہ طہٰ، آیت ۱۵)

قیامت کے علم کا مخفی رکھنا، اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمت کا تقاضا اور اس کی اسکیم کا حصہ ہے۔ معارف القرآن میں سورہ اعراف کی (مذکورہ ۱۸۷) آیت کی تفسیر میں کہا گیا ہے:

> مقصد اس کا یہ ہے کہ جس طرح انسان کی شخصی موت کی تاریخ اور وقت کو غیر معین و مبہم رکھنے میں بڑی حکمتیں ہیں اسی طرح قیامت کو جو پورے عالم کی اجتماعی موت کا نام ہے اس کو مخفی اور مبہم رکھنے میں بھی بڑی حکمتیں ہیں، اول تو یہی ہے کہ یقین کرنے والوں کے لیے اس صورت میں زندگی دو بھر اور دنیا کے کام مشکل ہو جائیں گے اور منکرین کو طویل میعاد سن کر استہزاء و تمسخر کا بہانہ ملے گا اور ان کی سرکشی میں اور اضافہ ہوگا۔ اس لیے بتقاضائے حکمت اس کی تاریخ کو مبہم رکھا گیا تاکہ لوگ اس کے ہول ناک واقعات سے ہمیشہ ڈرتے رہیں اور یہ ڈر ہی انسان کو جرائم سے باز رکھنے کا سب سے زیادہ موثر علاج ہے۔[۳]

رسول اللہ ﷺ نے متعدد احادیث میں قیامت کے واقعی (exact) وقت سے اپنی لاعلمی ظاہر فرمائی ہے۔ ایک مشہور حدیث (جسے حدیث جبرئیل کہا جاتا ہے) میں آیا ہے کہ ایک دفعہ جبرئیل علیہ السلام، صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں، انسانی شکل میں آپ ﷺ کے پاس تشریف لائے اور کئی سوالات کیے جن کے آپ نے جوابات عنایت فرمائے، لیکن جب انھوں نے سوال کیا کہ متی الساعۃ (قیامت کب آئے گی؟) تو آپ ﷺ نے جواب دیا ما المسؤول عنھا باعلم من السائل (جواب دینے والا پوچھنے والے سے کچھ زیادہ نہیں جانتا)۔ یعنی قیامت کے وقت کا مکمل علم نہ جبرئیلؑ کو ہے نہ آپ ﷺ کو۔

البتہ آپ ﷺ نے متعدد جگہوں پر قیامت کی کچھ نشانیوں کا ذکر فرمایا ہے۔[۴] لیکن جن روایتوں میں ان نشانیوں کا ذکر ہے ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نشانیاں

بھی زبان نبوت سے اس طرح بیان ہوئی ہیں کہ ان سے، امت کے اندر، قیامت کے سلسلہ میں تجسس اور فکر مندی تو پیدا ہوتی ہے لیکن حقیقی وقت کا تعین نہیں ہو پاتا۔ مولانا رفیع عثمانی اس موضوع پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

اتنی کثیر علامات اور ان کی تفصیلات سے بعض اوقات قاری یہ توقع بھی کرنے لگتا ہے کہ واقعات کی کڑیاں ملا کر وہ قیامت کا ٹھیک ٹھیک زمانہ متعین کرنے میں کام یاب ہو جائے گا، لیکن نہ ایسا ہوا ہے نہ ہو سکے گا، قرآن حکیم کا واضح ارشاد ہے کہ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً (قیامت تم پر اچانک آپڑے گی) وجہ یہ ہے کہ اول تو بہت سی علامتوں میں ترتیب ہی کا ادراک نہیں ہوتا کہ کون سا واقعہ پہلے اور کون سا بعد میں ہوگا، اور جن واقعات کی ترتیب احادیث میں بیان کردی گئی ہے ان میں بھی متعدد مقامات پر یہ پتہ نہیں چلتا کہ دونوں واقعوں کے درمیان کتنے زمانہ کا فاصلہ ہے، پھر بہت سی احادیث میں ایسا اجمال ہے کہ ان کی مراد یقینی طور پر متعین نہیں ہوتی، حتی کہ بعض مقامات پر پڑھنے والے کو تعارض کا شبہ ہونے لگتا ہے، حالاں کہ وہاں اجمال ہے تعارض نہیں۔[۵]

ان سب حقائق کے باوجود، قیامت کے وقت کے پیچھے پڑنا اور اس کے ماہ و سال کا حساب لگانے کی کوشش کرنا ایک بے معنی اور لاحاصل عمل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر شخص کے لیے اس کی موت ہی قیامت ہے۔ اس لیے کہ موت کے ساتھ ہی عمل کی مہلت ختم ہو جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے کئی دفعہ موت کو قیامت کہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بدّو حاضر ہوتے تھے اور وہ آپ سے سوال کرتے تھے کہ قیامت کب آئے گی؟ تو آپ ان میں سب سے کم عمر شخص کی طرف اشارہ کر کے فرماتے تھے: إن يعش هذا لا يدركه الهرم حتى تقوم عليكم ساعتكم (اگر یہ بچہ زندہ رہا تو اس کے بڑھاپے سے پہلے تم پر تمہاری قیامت آجائے گی۔) امام بخاریؒ نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد ریمارک کیا ہے کہ قال هشام يعني موتهم (ہشام نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد (قیامت سے) ان کی موت تھی۔)[۶] یعنی اس بچے کے مرنے سے پہلے تم سب مر جاؤ گے اور وہی تمہاری قیامت ہے۔

قیامت کی علامات اور ان کی تین قسمیں

صحیح احادیث میں قیامت کی جو علامتیں بیان کی گئی ہیں، اُن کی تین نمایاں قسمیں ہیں۔ پہلی قسم اُن علامتوں کی ہے جو ظاہر ہو چکی ہیں۔ دوسری قسم اُن علامتوں کی ہے جو بہت عمومی قسم کی ہیں اور جن کے وقوع کے کسی خاص زمانے کا تعین نہایت مشکل ہے، بلکہ اُن میں سے اکثر مختلف زمانوں میں بار بار ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد مختلف زمانوں میں یہ محسوس کیا جاتا رہا کہ یہ علامتیں ظاہر ہونے لگی ہیں۔ تیسری قسم اُن متعین اور نہایت واضح علامتوں کی ہے، جو قیامت کے بالکل قریب ظاہر ہوں گی۔

پہلی قسم، یعنی وہ علامتیں جو ظاہر ہو چکی ہیں اُن میں پہلی علامت تو رسول اللہ ﷺ کی وفات ہے جسے آپ ﷺ نے قیامت کی نشانی قرار دیا ہے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر عوف بن مالکؓ کو آپ نے قیامت کی چھ نشانیاں بتائیں اور کہا کہ پہلی نشانی میری موت ہے۔[۷] اس مفہوم کی اور روایات بھی حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ شق القمر کے واقعہ کو خود قرآن نے قیامت کی نشانی قرار دیا ہے، جو پیش آچکا ہے۔ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانشَقَّ الْقَمَرُ (قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا۔ سورہ قمر، آیت ۱) آپ ﷺ نے قرب قیامت سے متعلق علامتوں میں بعض ایسی باتوں کا بھی ذکر فرمایا جو آپ کی وفات کے فوری بعد قریبی زمانہ میں واقع ہو چکی ہیں۔ مثلاً یہ علامت کہ مسلمانوں کی دو جماعتیں باہم جنگ کریں گی۔[۸] اکثر شارحین حدیث کے نزدیک یہاں جنگ صفین کی طرف اشارہ ہے جو آپ کی وفات کے ۲۷ سال بعد دریائے فرات کے کنارے لڑی گئی تھی۔ یا آپ نے فرمایا کہ نبوت کے جھوٹے مدعیوں کا ظاہر ہونا بھی قیامت کی نشانی ہے۔ (ان بین یدی الساعة کذابین)[۹] ہم سب جانتے ہیں کہ آپ کی وفات کے فوری بعد اس فتنہ کا ظہور شروع ہو گیا تھا اور ہر زمانہ میں ایسے جھوٹے مدعین نبوت پیدا ہوتے رہے۔ ایک جگہ آپ نے فتح بیت المقدس (اعدد ستا بین یدی الساعة موتی، ثم فتح بیت المقدس)[۱۰] کو بھی قیامت کی نشانی قرار دیا۔ یہ واقعہ دو بار پیش آچکا ہے۔ آپ کی وفات کے چار سال بعد حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اور (پانچویں

صدی کے اواخر میں صلیبیوں کے ہاتھوں سقوط کے بعد) ۵۸۳ ہجری میں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے ہاتھوں۔ ارضِ حجاز سے ایک بڑی آگ کے بھڑک اٹھنے کے واقعہ کو نشانی کہا گیا (لاتقوم الساعة حتی تخرج نار من ارض الحجاز)[۱۱] امام نوویؒ نے ۶۵۴ ہجری میں پیش آئے آتش زنی کے ایک بڑے واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ نشانی بھی ظاہر ہو چکی ہے۔[۱۲] آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ "میں اور قیامت ان دو کی طرح بھیجے گئے ہیں۔ آپ کی مراد دو انگلیوں سے تھی۔[۱۳]" شارحین حدیث نے ان باتوں کی تشریح میں یہ بات کہی ہے کہ خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کے بعد، اللہ تعالیٰ کے ماہ و سال کے حساب سے، قیامت کا وقت کافی قریب آ گیا ہے۔ دنیا کی عمر کا جتنا وقت باقی ہے اُس سے کہیں زیادہ گزر چکا۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے قیامت کے قرب کی خبر دی اور آپ چاہتے تھے کہ آپ کے بعد آپ کے امتی ہمیشہ قیامت کو نہایت قریب سمجھ کر زندگی گزاریں۔

فتنوں اور برائیوں کا ظہور

دوسری قسم کی علامتیں وہ ہیں جن میں بعض برائیوں اور فتنوں کے ظہور کو قرب قیامت کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ ان علامتوں کو علامات صغریٰ بھی کہا جاتا ہے۔ قیامت کی آخری علامات ظاہر ہونے سے پہلے طرح طرح کے فتنوں کا ظہور ہوگا اور قیامت کے قریب آخر زمان میں یہ فتنے نہایت شدید ہو جائیں گے۔ صحیح احادیث میں آپ ﷺ نے ان فتنوں کے لیے بہت ہی خوف ناک تعبیرات استعمال فرمائی ہیں اور امت کو ان سے خبردار کیا ہے۔

یہ فتنے ظلم اور خون خرابے کی شکل میں بھی ہوں گے، ایمان پر حملوں اور اہل ایمان کے لیے طرح طرح کی دشواریوں کی شکل میں بھی ہوں گے اور برائیوں کے طوفان کی شکل میں بھی۔ مثلاً فرمایا کہ إن من اشراط الساعة ان یرفع العلم، ویثبت الجهل، ویشرب الخمر، ویظهر الزنا (علامات قیامت میں سے یہ ہے کہ علم اٹھ جائے گا اور جہل ہی جہل ظاہر ہو جائے گا۔ اور (علانیہ) شراب پی جائے گی اور زنا پھیل جائے گا)[۱۴]۔ لا تقوم الساعة حتی یظهر الفحش،

والتفاحش، وقطیعة الرحم، وسوء المجاورة (قیامت برپا نہیں ہوگی تاوقتیکہ بے حیائی اور فحش گوئی عام ہوجائے، قطع رحمی اور اور پڑوسیوں سے بدسلوکی کا چلن ہوجائے)۔[۱۵] لا تقوم الساعة حتی تلحق قبائل من أمتی بالمشركين، وحتی تعبد قبائل من أمتی الأوثان (قیامت نہیں آئے گی یہاں تک کہ میری امت کے قبائل مشرکوں سے جاملیں گے اور بتوں کی پوجا کرنے لگیں گے)۔[۱۶]

یہ برائیاں کم و بیش ہر زمانہ میں رہی ہیں۔ عام ہوجانے یا ان کے پھیل جانے کا کوئی واضح پیمانہ نہیں ہے۔ تاریخ میں متعدد بار اس طرح کی برائیوں، ظلم، قتل و غارت گری، فتنہ و فساد اور فواحش و منکرات کی نہایت تیز لہریں آئیں۔ ہم نہیں جانتے کہ اس طرح کی لہریں اور ان پر مبنی ادوار، کتنی بار قیامت تک آئیں گے؟ ہمیں ان برائیوں کو دیکھنے سے یہ احساس ہونا چاہیے کہ ان کی کثرت قیامت کا سبب بن سکتی ہے اور ان تنبیہات کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان برائیوں کی شناعت بیان کی جائے کہ یہ برائیاں اللہ کے غضب کو دعوت دینے والی ہیں۔ ان کا عام ہوجانا، دنیا کے خاتمے اور قیامت کے قرب کی نشانی ہے۔

ایک انسان کے لیے بیماری یا حادثہ موت کی علامت ہوتا ہے لیکن ہر انسان کی زندگی میں متعدد بار بیماریاں اور حادثات پیش آتے رہتے ہیں جو اللہ کی جانب سے تنبیہ اور موت کی تذکیر ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ کسی وقت اچانک آخری بیماری یا حادثہ اُسے موت سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ اسی طرح اس عالمِ انسانیت کی زندگی میں یہ فتنے اور علامات صغریٰ انسانوں کی تنبیہ کے لیے بار بار نمودار ہوتی رہیں گی۔ ایک حدیث میں یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ فتنوں کی ہر اگلی لہر، پچھلی لہر سے زیادہ شدید تر ہوگی۔ فإنه لا یاتی علیکم زمان إلا الذی بعده شر منه حتی تلقوا ربكم، سمعته من نبیكم صلی اللہ علیه وسلم۔ (تم پر جو دور بھی آتا ہے تو اس کے بعد آنے والا دور اس سے بھی برا ہو گا یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جاملو[۱۷]) یہاں تک کہ کسی وقت قیامت کی آخری علامات اچانک ظہور پذیر ہوجائیں گی۔ اگر کسی طرح کی علامات صغریٰ کا ظہور ہو رہا ہے تو نہ یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ یہ آخری دور ہے اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آخری دور نہیں ہے۔ اس طرح کی قیاس

آرائیوں کے لیے نہ کوئی ٹھوس بنیاد ہمارے پاس موجود ہے اور نہ ان کی کوئی ضرورت ہی ہمیں لاحق ہے۔ ہم اپنی ذمہ داریوں کے لیے جواب دہ ہیں اور ہر طرح کے فتنوں سے خود کو بچانے کی کوششوں کے مکلف ہیں۔ یہ کام ہم کو ہر حالت میں کرتے رہنا چاہیے۔

یاجوج ماجوج کے ظہور وغیرہ جیسی باتوں کو متعین علامت سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ واقعات کا ایک لمبا سلسلہ ہے جو کئی سو برسوں پر محیط ہے، اور اس کا آغاز بھی صدیوں پہلے ہو چکا ہے۔ مشہور عالم و محدث حضرت انور شاہ کشمیریؒ نے یاجوج ماجوج سے متعلق احادیث کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یاجوج ماجوج مختلف زمانوں میں بار بار آتے رہیں گے اور دنیا میں تباہی مچاتے رہیں گے۔ قیامت کے بالکل قریبی زمانے میں، عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد وہ پھر تباہی مچائیں گے اور حدیث کے مطابق ان کی بد دعا سے ہلاک ہو جائیں گے۔ حضرت کشمیریؒ نے تیمور لنگ، چنگیز خان، ہلاکو خان، ان سب کو، ان کی برپا کردہ تباہیوں کے پیش نظر یاجوج ماجوج قرار دیا ہے۔[۱۸]

قیامت کی علامات کبریٰ

علامتوں کی تیسری قسم وہ ہے جو بہت ہی متعین اور واضح ہے۔ اس میں مسیح دجال کا ظہور، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور، مہدی کا ظہور، دجال کے پیروکار یہودیوں کے ساتھ ایک بڑی جنگ، کعبہ پر چڑھائی کے لیے آنے والے ایک لشکر کا زمین میں دھنس جانا، دابہ کا ظاہر ہونا، سورج کا مغرب سے نکلنا وغیرہ جیسی علامتیں شامل ہیں۔ ان علامتوں کو شارحین حدیث علامات کبریٰ کہتے ہیں۔ یہ آخری علامتیں ہیں، جن کے بعد کسی بھی وقت اچانک قیامت برپا ہو جائے گی۔

یہ علامتیں یعنی علامات کبریٰ بہت واضح ہیں۔ لیکن ان کی دور از کار تاویلات کر کے، اپنے اپنے زمانے پر چسپاں کرنے کی کوشش ماضی میں بھی ہوتی رہی ہے۔ ایسی تاویلات نہ احادیث کے متن سے میل کھاتی ہیں اور نہ ان کے منشا سے۔ علامات کبریٰ میں ایک اہم علامت مسیح دجال کا ظہور ہے۔ سازشی نظریات کے لیے مسیح دجال کے کردار کی تاویلات کی جاتی ہیں۔ کئی لوگوں

نے، جدید تمدن، عالمی مقتدرہ، سیاسی و معاشی استعمار وغیرہ جیسی غیر مرئی چیزوں کو دجال قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ غیر ضروری تاویلیں ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

> جن احادیث میں دجال کا ذکر ہے اور اس کے اوصاف و علامات بیان کیے گئے ہیں، وہ تواتر معنی کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ان میں صاف اس کی صراحت ہے کہ وہ ایک معین شخص ہوگا جس کی کچھ معین صفات ہوں گی، وہ ایک خاص اور معین زمانہ میں ظاہر ہوگا نیز ایک معین قوم میں ظاہر ہوگا جو یہود ہیں۔ [19]

مولانا مودودیؒ کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ دجال کے منکر ہیں۔ لیکن مولاناؒ نے بڑی صراحت کے ساتھ یہ بات لکھی ہے کہ

> دجال آئے گا، ان صفات کا حامل ہوگا اور یہ فتنے برپا کرے گا۔ یہ بالکل یقینی خبریں ہیں جو آپ ﷺ نے اللہ کی طرف سے دی ہیں۔ ان میں کوئی روایت دوسری روایت سے مختلف نہیں ہے۔ [20]

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن روایتوں میں دجال کا ذکر آیا ہے انھی میں اس کی خاص صفات اور علامات بھی ذکر کی گئی ہیں۔ ان کو نظر انداز کر کے کسی اجتماعی ہئیت یا کسی غیر جان دار کو دجال باور کرانے کی کوشش بے محل ہے۔ دجال کے بارے میں صحیح احادیث کے تجزیئے سے ایک اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ کوئی پر اسرار، سازشی کردار نہیں ہوگا جو اپنے آپ کو مخفی رکھ کر اہل ایمان کو دھوکا دے۔ اس لیے اس کے سلسلہ میں قیاس آرائیوں اور وہم و گمان کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جب بھی ظاہر ہوگا اپنی مکمل شناخت کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ احادیث میں جو واضح علامتیں ہم کو ملتی ہیں ان میں اُس کے زندہ وجود ہونے، خوارق کے حامل ہونے اور رسالت و خدائی کے دعوے دار ہونے کے علاوہ، ایک اہم علامت یہ بیان ہوئی ہے کہ "مکتوب بین عینیه کافر یقرؤه کل مؤمن کاتب وغیر کاتب" (اس کی دونوں آنکھوں کے بیچ میں کافر لکھا ہوگا جس کو ہر مؤمن پڑھ لے گا خواہ لکھنا جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔) [21]

یعنی اس کا کفر کا علم بردار ہونا بالکل واضح اور علانیہ ہوگا اور کسی مومن کو اس معاملہ میں کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔

اسی طرح، جدید ٹکنالوجی کی ترقیوں کو دجال اور دجالی فتنہ سمجھنا بھی ایک غلط نقطہ نظر ہے۔ اس مسئلہ پر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کا تبصرہ بڑا اہم ہے، فرماتے ہیں:

قوانین قدرت پر غیر معمولی اقتدار بجائے خود ایسی چیز نہیں ہے جو آدمی کو دجال بنادے بلکہ قرآنی تعلیم کی رو سے تو قدرت کے قوانین سے استفادہ نسل انسانی کے مقام خلافت کا عام اقتضا ہے۔ آدم علیہ السلام کو اسماء کا جو علم بخشا گیا تھا، اسی اجمالی علم کی یہ تفسیر ہے۔ [۲۲]

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد رشید مولانا بدر عالم مہاجر مدنیؒ نے اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے بڑی اہم بات کہی ہے۔

ہمارے زمانے میں مادی ترقیات خواہ کتنی بھی ہوجائیں، وہ سب مادی قوانین کے تحت ہیں۔ ان کو دجالی فتنہ سمجھنا بالکل بے محل بلکہ خلاف واقعہ بات ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ زمانے میں جو ایجادات سامنے آرہی ہیں وہ عجیب سے عجیب تر ہیں لیکن موجودہ دنیا کی ترقی یافتہ قومیں سب ہی اس میں شریک ہیں... اس لیے بھی ان میں سے کسی کو دجالی فتنہ قرار دینا قبل از وقت ہے بلکہ ان کو اس کے مقدمات میں شمار کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ اسکا مقدمہ دینی جہل، ضعف ایمان اور طغیانی طاقتوں کا ہمہ گیر اقتدار ہے۔ [۲۳]

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے جدید مغربی تہذیب و تمدن کو دجال اکبر قرار دینے کو ”زود فکری اور زود بیانی کا عارضہ“ قرار دیا ہے [۲۴] لیکن یہ بات بھی فرمائی ہے کہ

مغرب کا جدید تمدن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ المسیح الدجال کے خروج کی زمین تیار کر رہا ہے — صحیح اور صاف جچی تلی بات جس میں خواہ مخواہ نبوت کے الفاظ میں کھینچ تان اور رکیک تاویلوں کی ضرورت نہیں ہوتی یہی ہے کہ المسیح الدجال کے خروج کا دعویٰ تو قبل از وقت ہے مگر المسیح الدجال جس فتنے میں دنیا کو مبتلا کرے گا، اس فتنے کے ظہور کی ابتدا کسی نہ کسی رنگ میں مان لینا چاہیے کہ ہو چکی ہے۔ [۲۵]

مولانا ابوالحسن ندویؒ نے بھی یہی خیال ظاہر فرمایا ہے۔ ان کی مختصر کتاب ”معرکہ ایمان و مادیت“ [۲۶] اس موضوع پر بڑی چشم کشا کتاب ہے۔ مولانا نے مغرب کی جدید مادہ پرست تہذیب کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

دجالی اور پرفریب روح اس تہذیب میں اس وجہ سے داخل ہوئی اور سرایت کرگئی کہ اس

نے بھی نبوت، آخرت، غیب، خالق کائنات اور اس کی قدرت کاملہ پر ایمان اور اس کی شریعت و تعلیمات کا بالکل مخالف رخ اختیار کیا، حواس ظاہری پر زیادہ سے زیادہ بھروسا کیا اور صرف ان چیزوں سے دل چسپی رکھی جو انسان کو جسمانی لذت، فوری منفعت اور ظاہری عروج و غلبہ سے ہم کنار کر سکیں۔[۲۷]

ہمارا طالب علمانہ خیال یہ ہے کہ مقدماتِ دجال، ہر زمانہ میں ظہور پذیر ہوتے رہے ہیں۔ دجالی اور پرفریب روح، تاریخ کے ہر دور میں باطل شیطانی نظاموں اور تہذیبوں میں کارفرما رہی ہے۔ اسلامی تاریخ میں اس سے پہلے بھی متعدد مرتبہ پیش آمدہ واقعات کو مقدمات دجال سمجھا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے فوری بعد پیش آنے والے واقعات (فتنہ ارتداد اور چھوٹے مدعیان نبوت کا فتنہ وغیرہ) سے لے کر خلافت راشدہ کے بعد کے واقعات اور پھر تاتاری و صلیبی حملوں تک اور اس کے بعد مغربی استعمار، دور غلامی اور نوآبادیاتی نظام تک، ہر دور میں باطل کی قوت وطاقت کو دجال کا پیش خیمہ سمجھا گیا ہے۔ اس لیے مقدماتِ دجال کو بھی ہم فتنوں ہی کی، یا علامات صغریٰ ہی کی ایک قسم سمجھتے ہیں جن کے بارے میں ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ یہ بیماری یا حادثے کی طرح کی اجتماعی وارننگ ہے جس کا بار بار ظہور ہوتا رہتا ہے۔ کوئی وارننگ آخری وارننگ ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی ہو سکتی۔ جدید مغربی تہذیب اور موجودہ دور کے سیاسی و عسکری فتنے، ظہور دجال کا پیش خیمہ ہو بھی سکتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اللہ کی تنبیہات کے سلسلہ کا ایک حصہ ہو اور آئندہ اور کئی ادوار، فتنوں کی لہریں اور تاریخ کے اتار چڑھاؤ پیش آنے والے ہوں۔ اس معاملہ میں کسی حتمی نتیجہ تک پہنچنا نہ ہمارے لیے ممکن ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔

ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیے؟

اوپر کے مباحث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی آخر الزماں کی بعثت کے ساتھ ہی آخر زمان کا آغاز ہو چکا ہے اور فتنے وقتاً فوقتاً سر ابھارتے رہتے ہیں۔

وہ علامتیں جن کا تعلق فتنوں سے ہے، ان کے سلسلے میں مسلسل اللہ سے دعا کرتے رہنا چاہیے، اس کی پناہ مانگنی چاہیے اور ان فتنوں سے بچنے کی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ یہ تعلیم بھی ہم کو

صحیح احادیث میں تاکید کے ساتھ ملتی ہے۔ خاص طور پر فتنہ دجال سے حفاظت کی دعا رسول اللہ ﷺ نے سیکھائی ہے، اس کا اہتمام کرنا چاہیے اور جو فتنے بھی برپا ہوتے رہیں اُن کے سلسلہ میں اس بحث میں پڑے بغیر کہ یہ آخری دور کے فتنے ہیں یا فتنوں کے سلسلے کا حصہ ہیں، ہمیں فتنوں کا حوصلہ و ہمت اور مومنانہ استقامت کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے۔ جن باتوں کی خبر آنحضرت ﷺ نے دی ہے وہ اللہ کے تکوینی امر کا حصہ ہیں اور اپنے وقت پر ان کی تکمیل ہوگی لیکن ہم اپنی ذمہ داریوں کے سلسلے میں مکلف ہیں، وہ ہر حال میں ادا کرنے کی کوشش ہم کو کرتے رہنا چاہیے۔

فتنہ دجال سمیت، تمام فتنوں سے بچنے کی عملی تدابیر کیا ہیں؟ صحیح احادیث میں ان کے سلسلہ میں بھی رہ نمائی ملتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فتنہ دجال سے بچنے کے لیے سورہ کہف کی تلاوت کی ہدایت فرمائی ہے۔ ایک روایت میں ابتدائی دس آیتوں کا[۲۸] اور ایک میں آخری دس آیتوں کا ذکر ہے۔[۲۹] کئی علما نے سورہ کہف پر اس مقصد سے غور کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس میں فتنہ دجال سے بچنے کے سلسلہ میں کیا اشارات پائے جاتے ہیں؟ اس میں جو اشارات ہیں وہ بھی انھی صفات و کاموں سے متعلق ہیں جو ایک مسلمان سے ہر زمانہ میں مطلوب ہیں۔ اس لیے چاہے سورہ کہف کو بنیاد بنائیں یا قرآن و حدیث کی عام تعلیمات کو، ہر جگہ یہی نظر آتا ہے کہ فتنوں سے تحفظ مومنانہ اوصاف، مومنانہ کردار اور مومنانہ ذمہ داریوں کے بکمال اہتمام ہی پر منحصر ہے۔ چند اشاروں کا بطور مثال نیچے ذکر کیا جا رہا ہے۔

❶ کتاب اللہ سے گہرا تعلق: اللہ کی کتاب فتنوں سے تحفظ کا موثر ترین اور اہم ترین ذریعہ ہے یہ بات ہم کو اسلامی نصوص میں کثرت سے ملتی ہے۔ جہاں تک سورہ کہف کا تعلق ہے، اُس کا آغاز ہی کتاب اللہ کے ذکر سے ہوتا ہے۔ پھر اصحاب کہف کے واقعہ کے ذکر کے فوری بعد جو احکام آیات ۲۷ سے ۳۰ تک آئے ہیں ان میں جو پہلا حکم دیا گیا ہے وہ کتاب اللہ کو پڑھتے رہنے کا حکم ہے۔ وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَلَن تَجِدَ مِن دُونِهِ مُلْتَحَدًا (اور اپنے پروردگار کی کتاب جو تمہارے پاس بھیجی جاتی ہے پڑھتے رہا کرو۔ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا

نہیں۔ اور اس کے سوا تم کہیں پناہ کی جگہ بھی نہیں پاؤ گے۔ کہف:۲۷) ایک طویل حدیث میں یہ مضمون بڑی وضاحت اور بڑے زور کے ساتھ آیا ہے۔ اسے بعض محدثین نے گرچہ ضعیف قرار دیا ہے لیکن اس کے معنوں کی تائید کی ہے اور اس سے استدلال بھی کیا گیا ہے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بار متنبہ کیا کہ آگاہ ہو جاؤ، ایک بڑا فتنہ آنے والا ہے! میں نے عرض کیا: "یارسول اللہ! اس فتنہ کے شر سے بچنے اور نجات پانے کا ذریعہ کیا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "کتاب اللہ! اس میں تم سے پہلی اُمتوں کے قصے ہیں اور تمہارے بعد والوں کی خبریں ہیں اور تمہارے بیچ پیدا ہونے والے معاملات کا حکم ہے، وہ قولِ فیصل ہے۔ جو کوئی ہدایت کو قرآن کے بغیر تلاش کرے گا اس کے حصہ میں اللہ کی طرف سے صرف گم راہی آئے گی۔ قرآن ہی اللہ کی مضبوط رسی ہے۔ حکمت سے پر تذکیر ہے سیدھا راستہ ہے، اسی کی پیروی سے خیالات کجی سے محفوظ رہتے ہیں، اور زبانیں اس کو گڑبڑ نہیں کر سکتیں اور علم والے کبھی اس کے علم سے سیر نہیں ہوں گے اور وہ کبھی پرانا نہیں ہو گا اور اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ جس نے قرآن کے موافق بات کہی اس نے سچی بات کہی، اور جس نے قرآن پر عمل کیا وہ مستحق اجر و ثواب ہوا۔ اور جس نے قرآن کے موافق فیصلہ کیا اس نے عدل و انصاف کیا، اور جس نے قرآن کی طرف دعوت دی اس کو صراط مستقیم کی ہدایت نصیب ہو گئی۔[۳۰]

فتنوں سے حفاظت میں اللہ کی کتاب کا جو رول ہے وہ بالکل واضح ہے۔ فتنوں کی شدت میں مسلمانوں کا قرآن سے تعلق اور مضبوط و مستحکم ہونا چاہیے اور ہر مسئلہ کا حل اور ہر قدم پر رہ نمائی قرآن کی روشنی میں حاصل کرنے کی سنجیدہ کوشش ہونی چاہیے۔

❷ قیامت کو یاد رکھنا، دین کی روح پر توجہ دینا، اور متشابہات کے پیچھے نہ پڑنا: علامات قیامت کا اصل مقصد قیامت کے تعلق سے امت کو ہمیشہ چوکس اور ہوشیار رکھنا ہے۔ جب تک واضح علامتیں، یعنی علامات کبریٰ ظاہر نہیں ہو جاتیں (جو اتنی واضح ہیں کہ ان کے لیے کسی جستجو کی ضرورت نہیں ہو گی) اس وقت تک فتنوں کی دور از کار تاویلات، وہم و گمان، آخر زمان کی نشانیوں کی

کھوج اور جستجو بے معنی عمل ہے اور اس کے چکر میں دنیا اور دنیا کے امور کے تئیں مستقل متشکک، انفعالی اور سلبی رویہ شدید نقصان دہ اور مہلک ہے۔ ہم کو ہمیشہ قیامت کے لیے تیاری کرتے رہنا چاہیے اور جو واقعات متشابہات میں سے ہیں ان کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے۔

سورہ کہف کا بھی ایک اہم سبق یہ ہے کہ انسان کو متشابہات کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے۔ جن واقعات و احوال کا مطلق علم ہماری دسترس سے باہر ہے، ان کے پیچھے لاحاصل قیاس آرائیوں اور بے بنیاد اٹکلوں کے بجائے، اپنے کام، ذمہ داریوں اور واقعات سے حاصل ہونے والے سبق پر توجہ مرکوز ہونی چاہیے۔ زوال یافتہ مذہبیت کی پیدا کردہ مریضانہ ذہنیت کو، احکام و آیات الٰہی کے اصل مقصد و منشا کے بجائے، بے مقصد تجسس، قصہ گوئی و افسانہ تراشی اور لایعنی موشگافیوں میں مزہ آنے لگتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں اہل کتاب اسی نفسیات کے شکار تھے جس پر قرآن نے چوٹ کی ہے۔ وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا ۔ قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا لَهُ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَبْصِرْ بِهِ وَأَسْمِعْ مَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے، اور (کچھ لوگ مدّت کے شمار میں) ۹ سال اور بڑھ گئے ہیں۔ تم کہو، اللہ ان کے قیام کی مدّت زیادہ جانتا ہے، آسمانوں اور زمین کے سب پوشیدہ احوال اُسی کو معلوم ہیں، کیا خوب ہے وہ دیکھنے والا اور سننے والا! زمین و آسمان کی مخلوقات کا کوئی خبر گیر اُس کے سوا نہیں، اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ سورہ کہف، آیت ۲۵، ۲۶) یہی درس موسیٰ و خضر کے واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ جس بات کا علم نہ ہو اس کے سلسلہ میں صبر کیا جائے۔ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا (اور جس چیز کی آپ کو خبر نہ ہو آخر آپ اس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں۔ سورہ کہف، آیت ٦٨)

سورہ اعراف کی آیت ۱۸۷ کے آخری فقرے کی تفسیر میں، مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے جو ریمارک کیا ہے وہ بڑا معنی خیز اور اس بحث میں فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہے۔ فرماتے ہیں:

> لیکن اکثر لوگ اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ کیا چیز ان کے جاننے کی ہے جس کے انھیں درپے ہونا چاہیے اور کیا چیز ان کے حدود علم سے ماوراء ہے جس کے پیچھے پڑنا محض

اوقات کی اضاعت اور اپنے آپ کو فتنوں میں مبتلا کرنا ہے۔ انسان کی یہ عجیب بدبختی ہے کہ وہ زیادہ تر ان چیزوں کے پیچھے پڑتا ہے جن کو نہ تو وہ جان سکتا ہے نہ وہ اس کے جاننے کی ہیں اور پھر ان کو بہانہ بنا کر ان حقائق سے منہ موڑ لیتا ہے جن کو جاننا اس کی دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کے لیے ضروری ہے۔ جو لوگ متشابہات کے پیچھے پڑ کر محکمات کا انکار کرتے ہیں ان کی بھی اصلی بیماری یہی ہے۔[۳۱]

❸ استقامت کے ساتھ اسلام پر جمے رہنا اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات پر اور فتنوں کے مقابلہ میں صبر کرنا اور دوسروں کو صبر کی تلقین کرنا: دور فتن کے تعلق سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: فان من ورائکم ایام الصبر الصبر فیه مثل قبض علی الجمر للعامل فیهم مثل اجر خمسین رجلا یعملون مثل عمله (لوگو تمہارے بعد ایسا زمانہ آنے والا ہے جس زمانے میں صبر کرنا پڑے گا — مشکل حالات میں قائم رہنا پڑے گا — نامساعد حالات میں استقامت کے ساتھ رہنا پڑے گا — اس وقت جو دین اور اس کے احکامات کو مضبوطی سے تھامے گا اور دین کے احکامات پر عمل کرے گا، اس کو اس طرح کے امور سر انجام دینے والے ۵۰ افراد کے برابر اجر دیا جائے گا۔)[۳۲] اصحاب کہف کے واقعہ سے بھی یہ سبق ملتا ہے کہ فتنوں کا مقابلہ اپنے دین و ایمان پر استقامت کے ساتھ جم کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اصحاب کہف کے واقعہ کے درس کا خلاصہ ایک جملہ میں اس طرح بیان کیا ہے:

> اگر کفار کا غلبہ بے پناہ ہو اور ایک مومن کو ظالم معاشرے میں سانس لینے تک کی مہلت نہ دی جا رہی ہو، تب بھی اس کو باطل کے آگے سر نہ جھکانا چاہیے بلکہ اللہ کے بھروسے پر تن بتقدیر نکل جانا چاہیے۔[۳۳]

سورہ کہف میں چار کرداروں کے حوالے سے چار اہم فتنوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

- ❑ دین و ایمان کے سلسلہ میں فتنہ جس کے مقابلہ کے لیے اصحاب کہف اپنا سب کچھ چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے،
- ❑ مال کا فتنہ یعنی مال پر غرور اور مال کی طاقت پر بھروسا جس کا دو باغوں والا شکار ہو گیا تھا۔

- ❑ علم کا فتنہ جس سے حفاظت کے لیے موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر پر اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ بہت سی باتیں بڑے سے بڑے انسان کے بھی دائرہ علم سے باہر ہیں اور
- ❑ اقتدار و صلاحیت کا فتنہ جس پر قابو کی خوبصورت مثال ذوالقرنین کے کردار میں ملتی ہے جنھوں نے ایک بڑے کارنامہ کو انجام دینے کے بعد بھی عجز و انکساری کے ساتھ یہی کہا کہ هَٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّي (یہ سب میرے رب کی رحمت ہے۔ سورہ کہف، آیت ۹۸)۔

اس طرح اس سورہ کے واقعات سے دین و ایمان کی حفاظت کے لیے استقامت و پامردی کا درس حاصل ہوتا ہے اور مال و دولت، علم و فضل اور بادشاہت و اقتدار کے حاصل ہونے پر تواضع و انکساری، اللہ کا شکر اور اس پر بھروسا اور نعمتوں کو اچھے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا سبق ملتا ہے۔ یہ اسباق اہل ایمان کو تمام فتنوں سے مقابلے کا راستہ دکھاتے ہیں۔

4 اللہ کے دین کی راہ میں جدوجہد، فتنوں کا مقابلہ، دعوت و تبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ: فتنوں کے زمانے میں جہد و عمل سے گریز کا نہیں بلکہ جدوجہد کی رفتار تیز کرنے کا حکم ہے۔ ہر خلافِ اسلام رجحان کے خلاف کوشش اور جدوجہد کو ہم اپنی ذمہ داری سمجھیں، اس کے لیے اپنی قوت و توانائی کو بھرپور استعمال کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات بھی فرمائی ہے کہ اہل حق کا گروہ شدید فتنوں کے زمانے میں بھی دین کی خاطر جدوجہد کرتا رہے گا اور فتنوں اور فتنہ پردازوں سے مقابلہ کرتا رہے گا۔ لَنْ يَبْرَحَ هَٰذَا الدِّينُ قَائِمًا يُقَاتِلُ عَلَيْهِ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ۔[۴۳] (یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس دین کی خاطر قیامت تک جنگ کرتی رہے گی۔) فتنوں ہی کے تناظر میں آپ ﷺ نے یہ ہدایت بھی فرمائی ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام ان حالات میں اہل ایمان کو استقامت کے ساتھ کرتے رہنا چاہیے اور یہ کہ گناہوں پر خاموشی، گناہوں میں شامل ہونے کے مترادف ہے۔ إذا عُمِلتِ الخطيئةُ في الأرضِ ، كان من شهِدَها فكرِهَها كمن غاب عنها، و من غاب عنها فرضيها كان كمن شهِدَها (جو شخص ان گناہوں کو دیکھے اور ان سے نفرت کرتے ہوئے اس کے ارتکاب سے دوسروں کو روکے

اور انھیں ببانگِ دہل رد کرے تو اس کو گناہ سے دور رہنے والوں میں لکھا جائے گا...جو شخص گناہ سے دور رہا، مگر نہ اس سے نفرت کرتا ہے اور نہ اعلانیہ اس کو رد کرتا ہے، گویا یہ خاموشی اس کی رضامندی ہے، لہٰذا اس کی مثال گناہ نہ کر کے بھی ایسی ہے جیسے وہ گناہگاروں کے ساتھ گناہ میں شریک ہوا۔)

[۳۵] واضح رہے کہ امام ابوداؤد نے یہ حدیث کتاب الملاحم کے تحت بیان کی ہے۔ (جس میں قیامت کی نشانیوں اور برپا ہونے والے فتنوں سے متعلق احادیث جمع کی گئی ہیں)

اصحاب کہف کے واقعہ کے ذکر کے بعد بھی یہی ہدایت دی گئی ہے کہ لوگوں کی خوشی و ناراضی کی پروا کیے بغیر دعوت حق کا کام کرتے رہیں۔ وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (اور اعلان کر دو کہ یہ سراسر برحق قرآن تمہارے رب کی طرف سے ہے۔ اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔ سورہ کہف، آیت ۲۹)

باطل قوتوں سے مقابلہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انتہائی ترقی یافتہ وسائل، اہل حق کے پاس ہوں۔ اس کا بھی واضح حکم قرآن نے دیا ہے (وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ۔ سورہ انفال، آیت ۶۰) ٹکنالوجی اور جدید دور کی کش مکش کے وسائل کو دجالی جال سمجھ کر نظر انداز نہیں کرنا ہے بلکہ ان پر قدرت حاصل کرنی ہے اور ایجاد و اختراع کے ذریعے بہتر وسائل کے حصول میں اپنا رول ادا کرنا ہے۔

ذوالقرنین کے واقعہ سے بھی یہی سبق ملتا ہے کہ ظالم و جابر اور خوں خوار قوتوں سے بچاؤ کے لیے تمام ممکنہ تدبیریں اختیار کی جائیں، سارے ممکنہ وسائل استعمال کیے جائیں، ایجاد و اختراع کی صلاحیتوں کو بھرپور طریقے سے روبہ کار لایا جائے، انوکھے حل ڈھونڈے جائیں، اپنی قوت و صلاحیت کا پورا استعمال کیا جائے اور اس کے بعد اللہ پر بھروسا رکھا جائے۔

فتنوں کے ذکر کے ساتھ ہی لوگ ان احادیث کا تذکرہ شروع کر دیتے ہیں جن میں جنگل اور غاروں میں پناہ لینے کی بات کہی گئی ہے۔ ہجرت اور جنگلوں میں پناہ آخری چارہ کار ہے جو اس وقت اختیار کیا جائے گا جب ایمان کی حفاظت کا کوئی اور راستہ نہ ہو۔ فمن وجد منها ملجأً أو

معاذا فلیعذ بہ(اس وقت جس کسی کو کوئی پناہ کی جگہ مل جائے یا بچاؤ کا مقام مل سکے وہ اس میں چلا جائے)۔[۳۶] اگر شہر میں رہ کر جان بچانا بالکل ممکن نہ ہو تو لوگ غاروں اور پہاڑوں میں روپوش ہو جاتے ہیں اور جوں ہی موقع ملتا ہے، عام زندگی کی طرف پلٹ آتے ہیں، یہی معاملہ دین وایمان کا بھی ہونا چاہیے لیکن فتنوں کے حقیقی یا خود ساختہ اندیشوں کے پیش نظر ترک دنیا اور کش مکش وجدوجہد سے گریز کے راستہ کی وکالت اور اس کی ترغیب، دراصل رہبانیت پسندی ہے جو دین اسلام کا مزاج ہرگز نہیں ہے۔ اصلاً تو ہر حال میں مقابلہ وکش مکش اور جہد پیہم اور سعی مسلسل ہی مومنانہ شیوہ ہے۔ متشابہات اور تاویلات کے پیچھے پڑنے کے بجائے اپنی ذمہ داریوں پر توجہات کو مرکوز کرنا اور عام قوانینِ فطرت کے راستہ سے حق اور سچائی کے غلبے کے طریقے سوچنا اور روبعمل لانا، یہ ہر حال میں ہمارا شیوہ ہونا چاہیے کہ اسی کے ہم مکلف ہیں۔

5 اجتماعیت اور نیک لوگوں کی رفاقت: ایک صحیح حدیث کے مطابق آپ نے شدید فتنوں کی خبر دی تو روایت کرنے والے صحابی نے پوچھا کہ اگر میں وہ زمانہ پاؤں تو آپ مجھے ان کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا کہ مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام کے ساتھ وابستگی کو اپنے اوپر لازم کرلینا۔(تلزم جماعة المسلمين و إمامهم)۔[۳۷]

یہ اشارہ سورہ کہف میں بھی ملتا ہے۔ اصحاب کہف کے واقعہ کے ذکر کے بعد جو ہدایات آئی ہیں ان میں ایک اہم ہدایت یہ ہے کہ **وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ** (اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جمائے رکھو جو صبح وشام اپنے رب کی رضاجوئی میں اس کو پکارتے ہیں۔ سورہ کہف، آیت ۲۸) فتنوں کے زمانہ میں اس بات کی ضرورت اور بڑھ جاتی ہے کہ نیک مسلمانوں کی صحبت میسر ہو اور ان کی مضبوط اجتماعیت کا ہم حصہ بنے رہیں۔ اکیلے فرد کا فتنے کا شکار ہو جانا آسان تر ہوتا ہے، لیکن اگر وہ اہل ایمان کی جماعت کے ساتھ وابستہ رہے تو فتنوں کا مقابلہ اور دفاع سہل ہو جاتا ہے۔

مولانا علی میاںؒ اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ دونوں نے اجتماعی زندگی کو اصحابِ کہف کے

واقعہ کا اہم سبق قرار دیا ہے۔ مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

اصحاب کہف کی اجمالی تعبیر کی آیتوں میں سب سے پہلی بات یہی نظر آئے گی کہ کہفی زندگی گزارنے والوں کو قرآن بجائے فرد واحد کے فتیۃ (نوجوانوں کی ایک ٹولی) قرار دیتا ہے۔ آپ چاہیں تو اس سے یہ نتیجہ پیدا کر سکتے ہیں کہ ایمانی آزمائش کے زمانے میں... اپنے ہم مذاق، ہم مشرب افراد کو آمادہ کیا جائے کہ کہفی زندگی میں ساتھ دے کر ایک دوسرے کے لیے باعث انس بھی ہوں اور ضرورت کے وقت باہم ایک دوسرے کی دست گیری و غم گساری بھی کر سکتے ہوں۔[۳۸]

مولانا علی میاںؒ لکھتے ہیں:

یہ ہو سکتا تھا کہ وہ منہ اٹھائے جدھر چاہے چل دیتے، ہر شخص اپنا راستہ لیتا اور اپنی دنیا الگ آباد کرتا اور ایک ایک غار یا پہاڑ کی چوٹی لے لے کر بیٹھ جاتا، جس طرح عیسائی اپنے دور انحطاط اور راہبانہ زندگی میں ہمیشہ کرتے آئے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ سب ایک ساتھ جماعتی طریقے پر اس شہر کو خیر باد کہیں، اپنے دین و عقیدہ کو سینے سے لگائے اور حرز جان بنائے ہوئے، خدا کی رحمت کے طلب گار، اور کشائش و کام یابی اور نصر مبین کے منتظر اور امیدوار، یہ وہ مناسب طریقہ اور صحیح راستہ ہے جو اہل ایمان کو ہر اس موقع پر اختیار کرنے کی ضرورت ہے جب زمین ان پر تنگ ہو چکی ہو۔[۳۹]

مذکورہ پانچوں باتیں ہر حال میں اہل اسلام سے مطلوب ہیں۔ لیکن فتنوں میں ان کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے اور فتنے ان مستقل ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرنے کا کام کرتے ہیں۔ ہمیں ہر حال میں ان کاموں کی طرف متوجہ رہنا چاہیے اور اگر کوئی غیر معمولی فتنہ محسوس بھی ہو رہا ہو تو ترک دنیا کی وکالت یا معاملات دنیا کے سلسلے میں منفی و سلبی رویے کا شکار نہیں ہونا چاہیے اور نہ دور کی کوڑی لا کر آخر زمان اور قیامت کا حساب لگانے بیٹھنا چاہیے بلکہ اپنی مستقل ذمہ داریوں پر توجہ بڑھادینی چاہیے اور انھیں اور زیادہ بہتر طریقے سے انجام دینے کی فکر کرنی چاہیے۔

(زندگی نو، جولائی ۲۰۲۰)

حواشی و حوالہ جات

۱ مسند احمد کی جس روایت میں دجال کے گدھے کا ذکر آیا ہے اسے علامہ البانی نے ضعیف قرار دیا ہے جب کہ حاکم اور ذہبی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

۲ اسماعیل بن عمر ابن کثیرؒ، تفسیر القرآن العظیم، الجزء الثالث، دار طیبه للنشر والتوزیغ، الریاض، ۱۹۹۹ص ۵۱۸، ۵۱۹

۳ مولانا مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، جلد چہارم، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ص ۱۴۱

۴ صحیح البخاری کتاب الإیمان باب سؤال جبریل النبی صلی اللہ علیه وسلم عن الإیمان والإسلام والإحسان وعلم الساعة، رواه ابو هریرة، و صحیح المسلم، کتاب الایمان، باب بیان الایمان والاسلام و الاحسان والایمان بالقدر، رواه عمر بن خطاب

۵ مفتی محمد رفیع عثمانی، علامات قیامت اور نزول مسیح، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۰۳، ص ۱۲۴

۶ صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب سکرات الموت، روته عائشةؓ

۷ صحیح البخاری، کتاب الجزیه والموادعه، بَابُ مَا یحْذَرُ مِنَ الْغَدْرِ

۸ صحیح البخاری، کِتَاب اسْتِتَابَةِ الْمُرْتَدِّينَ وَالْمُعَانِدِينَ وَقِتَالِهِمْ، بَابُ قَوْلِ النَّبِي صَلَّى اللَّهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ لاَ تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يقْتَتِلَ فِئَتَانِ دَعْوَتُهُمَا وَاحِدَة

۹ صحیح مسلم کتاب الفتن باب لاتقوم الساعة

۱۰ صحیح البخاری، کتاب الجزیه والموادعة، باب مایحذر من الغدر، رواه عوف بن مالك

۱۱ صحیح البخاری، کتاب الفتن، باب خروج النار، رواه انس بن مالکؓ

۱۲ علامہ وحید الزمان، مسلم شریف مع مختصر شرح نووی، جلد ششم، نعمانی کتب خانہ لاہور، ۲۰۰۴، ص ۴۲۶ و ۴۲۷

۱۳ .صحیح البخاری، کِتَاب الرِّقَاقِ، بَابُ قَوْلِ النَّبِي صَلَّى اللَّهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَين

۱۴ صحیح البخاری کتاب العلم، بَابُ رَفْعِ الْعِلْمِ وَظُهُورِ الْجَهْلِ، رواه انس بن مالك

۱۵ رواه أحمد: ٦٥١٤، وصححه الألبانی السلسلة الصحيحة:۲۲۸۸

۱۶۔ رواہ أبو داود: ٤٢٥٤، وصححه الألبانی صحيح الجامع:۱۷۷۳

۱۷۔ صحيح البخاری، كتاب الفتن، بَابُ لاَ يأْتِي زَمَانٌ إلاَّ الَّذِي بَعْدَهُ شَرٌّ مِنْهُ

۱۸۔ الشيخ محمد انور شاہ الكشميری الهندی، فيض الباری علی صحيح البخاری (مع حاشيه البدر الساری)، الجزء الرابع، دارالكتب العلميه، بيروت، ۲۰۰۵صفحات ۱۹۷ و ۳۵۸۔ ۳۶۰

۱۹۔ مولاناابوالحسن ندویؒ۔ معرکہ ایمان ومادیت، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنو،۱۹۹۸ص ۱۲۰

۲۰۔ مولاناسید ابوالاعلی مودودیؒ، رسائل ومسائل (تدوین نو) حصہ اول، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئ دہلی(۲۰۱۶)ص۴۲۶

۲۱۔ صحيح مسلم، كتاب الفتن و اشراط الساعة، باب ذكر الدجال، رواہ حذیفہؓ

۲۲۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی، دجالی فتنے کے نمایاں خد وخال، المیزان ناشران کتب، لاہور،۲۰۰۷، ص۱۹

۲۳۔ مولانابدرعالم مہاجر مدنی، ترجمان السنہ، جلد چہارم، ادارہ اسلامیات، لاہور،۱۹۶۸، ص۴۲۵

۲۴۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی، دجالی فتنے کے نمایاں خد وخال، المیزان ناشران کتب، لاہور،۲۰۰۷، ص۲۳

۲۵۔ ایضاً ص۲۵

۲۶۔ مولاناابوالحسن ندویؒ۔ معرکہ ایمان ومادیت، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنوٴ،۱۹۹۸،

۲۷۔ ایضاً ص۱۶

۲۸۔ من حفظ عشر آيات من اول سورة الكهف عصم من الدجال صحيح مسلم، كتاب فضائل القرآن و مايتعلق به، باب فضل سورة الكهف وآية الكرسی، رواہ ابو الدرداء

۲۹۔ من حفظ من خواتيم سورة الكهف عصم من فتنة الدجال، سنن ابی داود، كتاب الملاحم، باب خروج الدجال، حديث ٤٣٢٣، رواہ قتادہ: صححه الالبانی

۳۰۔ جامع الترمذی، ابواب فضائل القرآن، حديث رقم ۲۹۶۷ رواہ علی بن ابی طالبؓ، صححه نيسابوری و المنذری و قال الالبانی اسناده ضعيف

۳۱۔ مولاناامین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، جلد سوم، ص۴۰۵

۳۲۔ سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، حدیث ٤٣٤١
۳۳۔ مولانا مودودیؒ، تفہیم القرآن، جلد سوم ص۷
۳۴۔ صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب قوله: لا تزال طائفة من أمتی ظاهرین علی الحق لا یضرهم من خالفهم
۳۵۔ سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، حدیث ۴۳۴۵
۳۶۔ صحیح البخاری، کتاب الفتن، باب تَكُونُ فِتْنَةٌ الْقَاعِدُ فِيهَا خَيرٌ مِنَ الْقَائِمِ
۳۷۔ صحیح البخاری، کتاب الفتن، بَابُ لاَ یأْتِی زَمَانٌ إِلاَّ الَّذِی بَعْدَهُ شَرٌّ مِنْهُ
۳۸۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی، دجالی فتنے کے نمایاں خد وخال، المیزان ناشران کتب، لاہور، ۲۰۰۷، ص۱۱۲
۳۹۔ مولانا ابوالحسن ندویؒ، معرکہ ایمان ومادیت، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ،۱۹۹۸، ص۵۵،۵٦